عقائد

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ

حاج شیخ حسین وحید خراسانی دام ظلہ العالی

ناشر:

مدرسۃ الامام باقر العلوم علیہ السلام ۔ قم

قم، خیابان شہداء (صفائیہ)، کوچہ ۳۷، پلاک ۲۱، تلفن: ۷۴۳۲۵۶

فہرست

عنوانات — صفحہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعَالَمِيۡنَ
وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ آلِهِ الطَّاهِرِيۡنَ
لاَ سِيَّمَا بَقِيَّةِ اللّٰهِ فِي الۡاَرَضِيۡنَ

یہ کتاب فروع دین سے متعلق ہے،لیکن یہ مقدمہ اصول دین سے آگاہی کی غرض سے لکھا گیا ہے۔جس طرح نور کے مراتب ہیں اور سورج وشمع کا نور بھی حقیقی نور کے مراتب میں سے ہیں، اسی طرح اصول دین کی معرفت کے بھی مراتب ہیں۔یہ مقدمہ کوئی عمیق تحقیق نہیں، بلکہ اس راہ میں قدم رکھنے والوں کے لئے اصول دین سے آشنائی کی حد تک ایک شمع کی مانند ہے۔

اس مقدمے میں عقلی اعتبار سے نہایت آسان تمہیدات پر مبنی دلائل سے استدلال کیا گیا ہے اور روائی اعتبار سے ان منقولات پر مشتمل ہے جو سنی اور شیعہ کی کتب احادیث اور مشہور تواریخ میں مذکور ہیں اور اس بارے میں خبر دینے کے لئے ،اگر چہ راوی ثقہ ہے یا جو بات نقل کی گئی ہے مورد وثوق ہے،ہمارا مستند وہی کتب ہیں جہاں سے ہم نے انہیں نقل کیا ہے۔

مبانی دین میں انوار آیات وروایات سے پرتو افشانی اس لئے کی گئی ہے کہ قرآن وسنت،فطرت کو بیدار کرنے والے اور حکمت کے دقیق ترین قواعد پر مشتمل ہیں۔

روایات کے ترجمے میں مضمون حدیث کے تقریبا مطابق،مختصر مضمون کو پیش کیا گیا ہے،عمومی جہت کو مد نظر رکھتے ہوئے بعض دقیق علمی نکات سے صرف نظر کی گئی ہے اور اختصار کے پیش نظر مطالب سے مربوط تمام جہات کو

پیش نہیں کیا گیا ہے۔

اصول دین کے بیان سے پہلے چند امور کی جانب توجہ ضروری ہے:

ا۔ تحصیل معرفت کا ضروری ہونا:

مبدأ ومعاد کے وجود کا احتمال، معرفت دین اور اس سلسلے میں تلاش وجستجو کو ضروری قرار دیتا ہے، کیونکہ اگر خالق جہاں، علیم وحکیم ہو، زندگی کا اختتام موت نہ ہو، خالق انسان نے اسے کسی مقصد وہدف کے تحت خلق کیا ہو اور اس کے لئے ایک ایسا نظام معین کیا ہو جس کی مخالفت ابدی بدبختی کا سبب ہو تو انسانی جبلت وفطرت اس امر کا تقاضا کرتی ہیں کہ چاہے یہ احتمال کم ہی کیوں نہ ہو، لیکن جس چیز کا احتمال دیا جارہا ہے اس کی عظمت واہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے، تاکہ تحقیق کے ذریعے منفی یا مثبت نتیجے تک پہنچا جاسکے۔ جیسا کہ اگر بجلی کے تار میں شارٹ سرکٹ کا احتمال ہو اور طے ہو کہ اس صورت میں زندگی آگ کا لقمہ بن سکتی ہے تو انسان اس وقت تک آرام وچین سے نہیں بیٹھتا جب تک اسے خطرہ ٹلنے کا یقین نہ ہو جائے۔

۲۔ انسان کو دینِ حق کی ضرورت:

انسان کا وجود جسم وروح اور عقل وہوس کا مرکب ہے اور اسی کا اثر ہے کہ اس کی فطرت مادی ومعنوی سعادت اور کمال مقصد تخلیق کو پانے کی جستجو میں ہے۔

ادھر انسان کی زندگی کے دو پہلو ہیں، فردی اور اجتماعی، بالکل ایسے ہی جیسے انسانی بدن کا ہر عضو اپنی ذاتی زندگی سے قطع نظر دوسرے اعضاء کے ساتھ بھی متقابلا تاثیر وتاثر رکھتا ہے۔

لہٰذا، انسان کو ایسے قانون وآئین کی ضرورت ہے جو اسے مادی ومعنوی سعادت اور پاک وپاکیزہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ضمانت دے اور ایسا آئین، دینِ حق ہے کہ جس کی انسان کو فطری طور پر ضرورت ہے ﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾(۱)

ہر موجود کے لئے ایک کمال ہے جس تک رسائی، اس کے مربوطہ تکامل وتربیت کے لئے معین کردہ قاعدے وقانون کی اتباع کے بغیر ناممکن ہے اور انسان بھی اس عمومی قاعدے وقانون سے مستثنیٰ نہیں ﴿قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْ أَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰى﴾(۲)

۳۔انفرادی زندگی میں دین کا کردار

انسان کی زندگی متن وحاشیہ اور اصل وفرع پر مشتمل ہے۔متن واصل، خود اس کا اپنا وجود ہے اور حواشی وفروع وہ چیزیں ہیں جو اس انسان سے تعلق رکھتی ہیں جیسے مال،مقام،شریکِ حیات،اولاد اور رشتہ دار۔

اپنی ذات اور اس سے متعلق اشیاء کی محبت نے انسانی زندگی کو دو آفتوں،غم واندوہ اور خوف وپریشانی کا آمیزہ بنا رکھا ہے۔جو کچھ اس کے پاس نہیں ہے اسے حاصل کرنے کا غم واندوہ اور جو کچھ اس کے پاس ہے،حوادث زمانہ کے تحت اسے کھو دینے کا خوف واضطراب۔

خداوندِ متعال پر ایمان ان دونوں آفتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے،کیونکہ عالم وقادر اور حکیم ورحیم پروردگار پر ایمان، اسے اپنی مقررہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے پر ابھارتا ہے اور فرائض بندگی پر عمل پیرا ہو کر وہ جان لیتا ہے کہ خداوندِ متعال اپنی حکمت ورحمت کے وسیلے سے، خیر وسعادت کا باعث بننے والی چیزیں اسے عنایت فرمائے گا اور اسبابِ شر وشقاوت کو اس سے دور فرمائے گا۔

بلکہ اس حقیقتِ مطلق کو پالینے کے بعد، کہ جس کے مقابلے میں ہر حقیقت مجاز ہے اور جس کے علاوہ باقی سب بظاہر پانی دکھائی دینے والے سراب ہیں،اس نے کچھ کھویا ہی نہیں اور اس امر پر یقین وایمان رکھتے ہوئے کہ ﴿مَا عِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَمَا عِنْدَاللّٰہِ بَاقٍ﴾(۳) کسی بھی فانی وناپائدار چیز میں اس کے لئے جاذبیت ہی نہیں کہ اس کے نہ ہونے سے غمگین اور چھن جانے سے مضطرب ہو﴿أَلاَ إِنَّ أَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لاَ خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلاَ ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۝الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَ کَانُوْا یَتَّقُوْنَ۝لَھُمُ الْبُشْریٰ فِی الْحَیَاۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْآخِرَۃِ لاَ تَبْدِیْلَ لِکَلِمَاتِ اللّٰہِ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴾(۴)

اس زندگی میں انسانی اعصاب کو کھوکھلا کر دینے والی چیز، مادی خواہشات کو پانے کی خوشی اور انہیں نہ پانے کے دکھ سے حاصل ہونے والی اضطرابی وہیجانی کیفیت ہے اور لنگر ایمان ہی ان طوفانی امواج میں مومن کو آرام واطمینان عطا کیا کرتا ہے ﴿لِکَیْلاَ تَأْسَوْا عَلیٰ مَا فَاتَکُمْ وَلاَ تَفْرَحُوْا بِمَا آتَاکُمْ﴾(۵) ﴿اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ أَلاَ بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْ

۴۔اجتماعی زندگی میں دین کا کردار

زیادہ سے زیادہ پانے کی ہوس کے غریزۂ افزون طلبی کی بدولت انسان میں موجود شہوت وغضب کسی حد تک محدود نہیں۔اگر مال کی شہوت اس پر غلبہ کرلے تو زمین کے خزانے بھی اسے قانع نہیں کر سکتے اور اگر مقام کی شہوت اس پر سوار ہو جائے تو روئے زمین کی حکومت و بادشاہی اس کے لئے ناکافی ثابت ہوتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ دوسرے سیاروں پر اپنی قدرت و حاکیت کا پرچم لہرائے ﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَاهَامَانُ ابْنِ لِي صَرْحاً لَعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ ۞ أَسْبَابَ السَّمَاوَاتِ﴾(۷)

انسان کا سرکش نفس، شکم ودامن، مال و مقام کی شہوت اور کبھی ختم نہ ہونے والی اندھی ہوس کے لئے قوت غضب کو کام میں لانے کے بعد کسی حد و حدود کو خاطر میں نہیں لاتا اور کسی بھی حق کو پامال کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ ایسی نفسانی شہوت کا نتیجہ بربادی اور ایسے غضب کا انجام خونریزی اور خاندانوں کے اجڑنے کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا، کیونکہ انسان اپنی قوتِ فکر کے ذریعے اسرارِ طبیعت کے طلسم کو توڑنے اور اس کی قوتوں کو اپنا غلام بنا کر اپنی نامحدود نفسانی خواہشات کو پانے کے لئے حیات، بلکہ کرۂ ارض کو جو انسانی حیات کا گہوارہ ہے، نابودی کی طرف لے جارہا ہے ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾(۸)

مبدأ ومعاد اور ثواب وعقاب پر ایمان کی طاقت ہی اس سرکش نفس کو مہار، انسانی شہوت وغضب کو تعادل اور فردی واجتماعی حقوق کی ضمانت فراہم کر سکتی ہے، کہ ایسے خدا پر اعتقاد جو ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ﴾(۹) اور اعمال کی ایسی جزا وسزا جو ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۞ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾(۱۰) پر ایمان کی وجہ سے، انسان ہر خیر کی جانب گامزن اور ہر شر سے دور ہوگا اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا جس کی بنیاد بقاء کے لئے ٹکراؤ کے بجائے بقاء کے لئے مصالحت کے فلسفے پر ہوگی۔

۵۔اصول دین سے آگاہی کی فضیلت وعظمت

فطری طور پر انسان علم کا پیاسا ہے، اس لئے کہ جو چیز انسان کو انسان بناتی ہے، عقل ہے اور عقل کا پھل علم ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب کسی جاہل کو جاہل کہا جائے تو یہ جاننے کے باوجود بھی کہ جاہل ہے غمگین ہو جاتا ہے اور اگر اسے علم سے نسبت دیں تو خوش ہو جاتا ہے۔

اسلام نے، جو دین فطرت ہے، علم کے مقابلے میں جہالت کو وہی مقام دیا ہے جو نور کے مقابلے میں ظلمت اور زندگی کے مقابلے میں موت کو حاصل ہے ((إنما هو نور يقع في قلب من يريد الله تبارک وتعالى أن يهديه))(۱۱) ((العالم بين الجهال كالحي بين الأموات))(۱۲)

لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ علم ذاتی طور پر با فضیلت ہونے کے باوجود مختلف مراتب کا حامل ہے، مثال کے طور پر علم کی فضیلت میں اس کے موضوع، نتیجے اور اس علم سے متعلق استدلال کی روش کے لحاظ سے تفاوت پایا جاتا ہے، جیسا کہ نباتات شناسی کی نسبت انسان شناسی اسی قدر افضل ہے جس قدر نباتات پر انسان کو فوقیت وفضیلت حاصل ہے۔ انسانی زندگی کو سلامتی عطا کرنے والا علم اس کے مال کی حفاظت کرنے والے علم سے اتنا ہی اشرف و با فضیلت ہے جتنا انسانی زندگی کو اس کے مال پر برتری وفضیلت حاصل ہے اور وہ علم جس کی بنیاد دلیل و برہان پر قائم ہے فرضی نظریات کی بنیاد پر قائم شدہ علم سے اتنا ہی زیادہ باشرف ہے جتنا گمان کے مقابلے میں یقین کو برتری وشرافت حاصل ہے۔

لہٰذا، تمام علوم میں وہ علم اشرف وافضل ہے جس کا موضوع خالق کائنات کی ذات ہے، لیکن یہ بات مد نظر رہے کہ غیر خدا کو خدا کے مقابلے میں وہ نسبت بھی حاصل نہیں ہے جو قطرے کو اقیانوس اور ذرے کو سورج کے مقابلے میں حاصل ہے۔ ان کے درمیان لامتناہی اور متناہی کی نسبت ہے، بلکہ دقیق نظر سے دیکھیں تو لاشئ اور فقیر بالذات کا غنی بالذات سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ﴿وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ﴾(۱۳)

اور اس علم کا ثمر و نتیجہ ایمان وعمل صالح ہیں جن کی بدولت انسان کو دینوی اور اخروی سعادت کے علاوہ انفرادی و اجتماعی حقوق حاصل ہوتے ہیں ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً﴾(۱۴) اور اس علم کی بنیاد، یقین و برہان پر ہے، ظن وگمان کی پیروی پر نہیں۔ ﴿اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّکَ بِالْحِكْمَةِ﴾(۱۵) ﴿وَلاَ تَقْفُ مَالَيْسَ لَکَ بِهِ عِلْمٌ﴾(۱۶) ﴿إِنَّ الظَّنَّ لاَ يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾(۱۷)

اب تک کی گفتگو سے اس حدیث کے معنی واضح ہو جاتے ہیں کہ ((إن أفضل الفرائض وأوجبها على الإنسان معرفة الرّب والإقرار له بالعبودية))(۱۸)

۶۔ ایمان ومعرفتِ پروردگار تک رسائی کی شرط

انسان، ہر اثر کے مؤثر کی تلاش وجستجو میں ہے اور فطرتِ انسانی، سرچشمۂ وجود کو پانے کی پیاسی ہے۔

لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ گوہرِ ایمان اور معرفت پروردگارِ عالم، جو گنجینۂ علم ومعرفت کے انمول جواہر ہیں، عدل وحکمت کے قاعدے وقانون کے مطابق کسی ایسے شخص کو نصیب نہیں ہو سکتے جو ایمان ومعرفتِ پروردگارِ عالم کے حق میں ظلم سے آلودہ ہو، کیونکہ نا اہل کو حکمت عطا کرنا حکمت کے ساتھ ظلم ہے اور اہل سے دریغ کرنا اہل حکمت کے ساتھ ظلم وزیادتی ہے۔

اور یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ خدا اور قیامت کا انکار اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان تمام ہستی کا احاطہ کرنے اور علل ومعلولات کے تمام سلسلوں تک پہنچنے کے بعد بھی مبدا ومعاد کو نہ پا سکے اور جب تک مذکورہ امور پر محیط فہم وادراک پیدا نہ ہوگا، مبدا ومعاد کے نہ ہونے کا یقین محال ہے، بلکہ جو ممکن ہے وہ مبدا ومعاد کو نہ جاننا ہے۔

لہٰذا، عدل وانصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جس کسی کو بھی اللہ کے وجود کے بارے میں شک ہے اسے چاہئے کہ قولی اور عملی طور پر مقتضائے شک پر عمل کرے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص ایسے خدا کے وجود کا احتمال دے کہ جس پر ایمان کی بدولت ابدی سعادت اور ایمان نہ ہونے کی صورت میں ابدی شقاوت اسے نصیب ہو سکتی ہے، عقلی نکتہ نظر سے اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دل وزبان سے اس کے وجود کا انکار نہ کرے اور عملی میدان میں جس قدر ممکن ہو اس حقیقت کی تلاش وجستجو میں کوشاں رہے اور منزلِ عمل میں احتیاط کا دامن نہ چھوڑے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پروردگار کی ذات موجود ہو جس کے احکامات سے سرتابی ابدی شقاوت کا باعث ہو، بالکل اسی طرح جیسے لذیذ ترین کھانے میں زہر کا احتمال دینے پر بحکم عقل اس کھانے سے پرہیز ضروری ہے۔

خدا کے وجود میں شک کرنے والا ہر شخص، اگر عقل کے اس منصفانہ حکم کے مطابق عمل کرے تو بغیر کسی شک وتردید کے، معرفت ·ایمانِ خدا کو پالے گا ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾(۱۹) ورنہ اس حقیقت کی ظلم سے آلودگی کے ساتھ اس قدوس ومتعال ذات کی معرفت حاصل نہ ہوگی ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾(۲۰) ﴿وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظَّالِمِيْنَ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ﴾(۲۱)

مذکورہ بالا نکات کی وضاحت کے بعد اب ہم اصول دین کی بحث شروع کرتے ہیں:

خدا پر ایمان لانے کا راستہ:

خدا پر ایمان لانے کی راہیں متعدد ہیں:

اہل اللہ کے لئے اس کی دلیل و معرفت کا ذریعہ خود اس کی ذات ہے ﴿أَوَ لَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾(۴۲)((یا من دل علی ذاته بذاته))(۴۳)، ((بک عرفتک وأنت دللتنی علیک))(۴۴)

اور اہل اللہ کے علاوہ بقیہ افراد کے لئے چند راہوں کی طرف مختصر طور پر اشارہ کرتے ہیں:

الف) انسان جب بھی خود اپنے یا اپنے حیطۂ ادراک میں موجود، موجودات کے کسی بھی جزء کے متعلق غور کرے تو اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اس جزء کا نہ ہونا محال نہیں ہے اور اس کا ہونا یا نہ ہونا ممکن ہے۔اس کی ذات عدم کی متقاضی ہے اور نہ ہی وجود کی.اور مذکورہ صفت کی حامل ہر ذات کو موجود ہونے کے لئے ایک سبب کی ضرورت ہے، اسی طرح جس طرح ترازو کے دو مساوی پلڑوں میں سے کسی ایک پلڑے کی دوسرے پر ترجیح بغیر کسی بیرونی عامل وسبب کے ناممکن ہے، اس فرق کے ساتھ کہ ممکن الوجود اپنے سبب کے ذریعے موجود ہے اور سبب نہ ہونے کی صورت میں عدم کا شکار ہے اور چونکہ اجزاء عالم میں سے ہر جزء کا وجود اپنے سبب کا محتاج ہے، لہٰذا اس نے یا تو خود اپنے آپ کو وجود عطا کیا ہے یا موجودات میں سے اسی جیسے موجود نے اسے وجود بخشا ہے۔لیکن جب اس کا اپنا وجود ہی نہ تھا تو خود کو کیسے وجود عطا کر سکتا ہے اور اس جیسا ممکن الوجود جس چیز پر خود قادر نہیں غیر کو کیا دے گا۔اور یہ حکم وقاعدہ جو کائنات کے ہر جزء میں جاری ہے، کل کائنات پر بھی جاری وساری ہے۔

جیسا کہ ایک روشن فضا کا وجود، جس کی اپنی ذاتی روشنی کوئی نہیں اس بات کی دلیل ہے کہ اس روشنی کا مبدا ضرور ہے جو اپنے ہی نور سے روشن ومنور ہے ورنہ ایسے مبدا کی غیر موجودگی میں فضا کا روشن ومنور ہونا ممکن ہی نہیں ہے، کیونکہ ذاتی طور پر تاریک موجود کا غیر،تو درکنار خود کو روشن کرنا بھی محال ہے۔

اسی لئے وجود کائنات اور اس کے کمالات ،مثال کے طور پر حیات، علم اور قدرت، ایک ایسی حقیقت کے وجود کی دلیل ہیں جس کا وجود، حیات، علم اور قدرت کسی غیر کے مرہون منت نہیں ﴿أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ﴾(۴۵)((عن ابی الحسن بن موسی الرضا - أنه دخل علیه رجل فقال له: یا ابن رسول اللّٰه! ما الدلیل علی حدوث العالم؟ فقال -: أنت لم تکن ثم کنت وقد علمت أنک لم تکوّن

نفسک و لا کوّنک من ھو مثلک))(۲۶)

ابوشاکر دیصانی نے چھٹے امام - سے پوچھا: اس بات کی کیا دلیل ہے کہ آپ - کوکوئی خلق کرنے والا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ((وجدت نفسی لا تخلو من إحدی الجھتین، إما أن أکوّن صنعتھا و کانت موجودۃ، أو صنعتھا و کانت معدومۃ فإن کنت صنعتھا و کانت موجودۃ فقد استغنیت بوجودھا عن صنعتھا، و إن کانت معدومۃ فإنک تعلم أن المعدوم لا یحدث شیئًا، فقد ثبت المعنی الثالث أن لی صانعًا و ھو اللّٰہ رب العالمین))(۲۷)

جو چیز نہ تھی اور موجود ہوئی یا تو خود اس نے خود کو وجود عطا کیا یا کسی غیر نے۔ اگر خود اس نے خود کو موجود کیا، یا تو وہ خود پہلے سے موجود تھی اور اس نے خود کو موجود کیا یا پہلے سے موجود نہ تھی، پہلی صورت میں موجود کو وجود عطا کرنا ہے جو محال ہے اور دوسری صورت میں معدوم کو وجود کی علت وسبب قرار دینا ہے اور یہ بھی محال ہے۔ اگر کسی دوسرے نے اسے وجود عطا کیا ہے اور وہ بھی پہلے نہ تھا اور بعد میں موجود ہوا ہے تو وہ اسی کی مانند ہے۔

لہٰذا، بحکم عقل جو بھی چیز پہلے نہ تھی اور بعد میں موجود ہوئی اس کے لئے ایسے خالق کا ہونا ضروری ہے جس کی ذات میں عدم ونابودی کا سرے سے کوئی عمل دخل نہ ہو۔

اسی لئے، کائنات میں رونما ہونے والی تمام تبدیلیاں اور موجودات اس خالق کے وجود پر دلیل ہیں جسے کسی دوسرے نے خلق نہیں کیا ہے اور وہ مصنوعات ومخلوقات کا ایسا خالق ہے جو خود مصنوع ومخلوق نہیں ہے۔

ب) اگر کسی بیابان میں کوئی ایسا ورق پڑا ملے جس پر الف سے یاء تک تمام حروف تہجی ترتیب سے لکھے ہوں، ہر انسان کا ضمیر یہ گواہی دے گا کہ ان حروف کی لکھائی اور ترتیب، فہم وادراک کا نتیجہ ہیں اور اگر انہی حروف سے کلمہ اور کلمات سے لکھا ہوا کلام دیکھے تو اس کلام کی بناوٹ وترکیب میں موجود دقت نظر کے ذریعے مؤلف کے علم وحکمت پر استدلال کرے گا نیز اگر کسی کی گفتار میں انہی خصوصیات کا مشاہدہ کرے گا تو مقرر کے علم وحکمت کا معترف ہو جائے گا۔ کیا ایک پودے میں موجود عناصر اولیہ کی ترکیب، کتاب کی ایک سطر کی جملہ بندی سے کم تر ہے، جو لکھنے والے کے علم پر ناقابل انکار دلیل ہے؟!

وہ کونسا علم اور کیسی حکمت ہے جس نے پانی اور مٹی میں بیج کے چھلکے کے لئے موت اور بوسیدگی کا مادہ فراہم کیا ہے اور اس بیج کے مغز کو پودے کی شکل میں زندگی عطا کی ہے؟!

جڑ کو وہ قدرت وطاقت عطا کی ہے کہ زمین کے دل کو چیر کر مٹی کی تاریک تہوں سے پودے کے لئے خوراک جذب کرتی ہے اور مٹی کے حصوں سے مختلف درختوں کے لئے خوراک فراہم کی ہے، تاکہ ہر پودا اور ہر درخت اپنی مخصوص خوراک حاصل کر سکے اور درختوں کی جڑوں کو ایسا بنایا ہے کہ وہ اپنی مخصوص خوراک کے علاوہ جو اس درخت کے مخصوص پھل کو جالتی ہے، کوئی اور خوراک جذب نہ کریں اور زمین کی کشش ثقل کا مقابلہ کرتے ہوئے پانی اور خوراک درخت کے تنے اور شاخوں تک پہنچائیں۔ جس وقت جڑیں زمین سے پانی اور خوراک لے کر درخت کے تنے اور شاخوں تک پہنچانے میں مصروف عمل ہوتی ہیں، اسی دوران تنا بھی فضا سے ہوا اور روشنی لینے کے عمل کو انجام دے رہا ہوتا ہے ((کلّ میسّر لما خلق له))(۲۸)، جس قدر بھی کوشش کی جائے کہ جڑ، جسے مٹی کے اعماق تک جانے اور تنا جسے فضا میں سر بلند کرنے کے لئے بنایا گیا ہے، کو اس حکیمانہ سنت سے روکیں اور اس کے برعکس جڑ کو فضا اور تنے کو مٹی میں قرار دیں تو یہ دونوں قانون کی اس خلاف ورزی کا مقابلہ کرتے ہوئے طبیعی طریقہ کار کے مطابق اپنی نشونما جاری رکھیں گے ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾(۲۹)

فقط ایک درخت اور ان رگوں کی جو اس کی جڑوں سے ہزار ہا پتوں تک حیرت انگیز نظام کے ساتھ پہنچائی گئی ہیں، بناوٹ اور پتوں کے ہر خلیے کو دی جانے والی قدرت وتوانائی میں غور وفکر، جس کے ذریعے وہ جڑوں سے اپنی خوراک اور پانی کو جذب کرتے ہیں، اس بات کے لئے کافی ہے کہ انسان لا متناہی علم وحکمت پر ایمان لے آئے ﴿اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَنْبَتْنَا بِهٖ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْبِتُوْا شَجَرَهَا ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ﴾(۳۰) ﴿ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ﴾(۳۱) ﴿وَ اَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ﴾(۳۲)

نیز جس پودے اور درخت کو دیکھیں، جڑ سے لے کر پھل تک حق تعالی کے علم، قدرت اور حکمت کی آیت ونشانی ہے اور ان کی نشونما کے لئے جو آئین مقرر کیا گیا ہے اس کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہے ﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ﴾(۳۳)

جیسا کہ کسی بھی جاندار کی زندگی میں غور وفکر، انسان کے لئے خدا کی طرف رہنما ہے۔

ابو شاکر دیصانی نے چھٹے امام - کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: اے جعفر بن محمد (علیہما السلام)! مجھے میرے معبود کی جانب رہنمائی فرمائیں۔ ایک چھوٹا بچہ مرغی کے انڈے کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ امام - نے اس بچے سے انڈا

لے کر فرمایا: "اے دیصانی! اس انڈے کے گرد محکم حصار ہے، اس کا چھلکا سخت ہے اور اس چھلکے کے نیچے باریک جھلی ہے۔ اس باریک جھلی کے نیچے پگھلا ہوا سونا اور سیال چاندی موجود ہے جو آپس میں نہیں ملتے۔ نہ تو اندر سے کوئی مصلح باہر آیا ہے جو اس کے بارے میں اصلاح کی خبر دے اور نہ ہی کوئی مفسد باہر سے اندر گیا ہے جو فساد کی اطلاع دے اور نہ ہی کوئی یہ جانتا ہے کہ انڈا نر کے لئے بنایا گیا ہے یا مادہ کے لئے۔" (۳۴)

آیا تصفیہ شدہ چونے کے ذریعے محکم حصار کو، جس میں بے انتہا اسرار پوشیدہ ہیں، کس صاحب تدبیر نے مرغی کے کھائے ہوئے دانوں سے جدا کر کے تخم دان میں چوزے کی پرورش کے لئے ایسا مقام امن بنایا اور اس کے اندر نطفے کو، صدف میں گوہر کی مانند جگہ دی۔ چونکہ چوزہ اس دوران ماں سے دور ہے اور رحم مادر میں نہیں ہے جہاں سے اپنی خوراک حاصل کر سکے، لہٰذا اس کے لئے اسی محکم حصار کے اندر اس کے قریب ہی خوراک کا انتظام کیا۔ چونے کی سخت دیوار اور چوزے اور اس کی خوراک کے درمیان نرم و نازک جھلی بنائی تاکہ چوزہ اور اس کی خوراک حصار کی سختی سے محفوظ رہیں۔ اس اندھیری اور تاریک فضا میں اس کے اعضاء و جوارح کو ہڈیوں، پٹھوں، رگوں، اعصاب اور حواس، جن میں سے فقط اس کی آنکھ کا دقیق مطالعہ محیر العقول ہے، کے ذریعے پایہ تکمیل تک پہنچا کر ہر ایک کو مناسب جگہ قرار دیا۔ اور چونکہ اس چوزے کو اپنی خوراک کے لئے مٹی اور پتھروں کے درمیان سے دانے چننے ہیں، لہٰذا اس کی چونچ ہڈی کی ایک خاص قسم سے بنائی تاکہ زمین پر موجود پتھروں کے ساتھ ٹکرانے سے اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اور کہیں اپنی خوراک سے محروم نہ ہو جائے، لہٰذا اسے سنگدانہ عطا کیا تاکہ جو بھی دانہ ملے اسے کھا کر اس میں محفوظ کر لے اور پھر اسے بتدریج نظام ہضم کے حوالے کرے۔ اس کی نازک کھال کو پروں کے ذریعے ڈھانپ کر سردی، گرمی، چوٹ اور جانوروں کے آزار سے محفوظ کیا۔ ضروریات و واجبات زندگی عطا کرنے کے علاوہ ظاہری خوبصورتی جیسے مستحبات سے غفلت نہیں برتی اور اس کے پروں کو دل موہ لینے والے رنگوں سے رنگ دیا، جیسا کہ امامؑ نے فرمایا: ((تنفلق عن مثل ألوان الطواویس))(۳۵)۔

اور چونکہ چوزے کے تکامل کے لئے مرغی کے سینے کی مناسب حرارت کی ضرورت ہے، وہ مرغی جسے فقط رات کی تاریکی ہی سعی و کوشش اور حرکت سے روک سکتی ہے اچانک اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ تلاش و جستجو کو چھوڑ کر جب تک حرارت کی ضرورت ہو، اس انڈے پر بیٹھی رہتی ہے۔

وہ کونسی حکمت ہے جس نے مرغی پر خمار جیسی کیفیت طاری کر دی ہے تاکہ وہ چوزے میں زندگی کی حرکت کو

وجود میں لا سکے؟! اور وہ کونسا استاد ہے جس نے اسے دن رات انڈوں کے رخ تبدیل کرنا سکھایا ہے تاکہ چوزے کے اعضاء میں تعادل برقرار رہے، جو چوزے کی راہنمائی کرتا ہے کہ خلقت مکمل ہونے کے بعد انڈے کے اس محکم حصار کو چونچ سے توڑ دے اور اس میدانِ زندگی میں قدم رکھے جس کے لئے اسے یہ اعضاء وجوارح عطا کئے گئے ہیں۔اور وہ مرغی جو اپنی حیوانی جبلت کے تحت، فقط اپنی زندگی سے نقصان دہ چیزوں کو دور اور فائدہ مند چیزوں کو انتخاب کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا عمل انجام ہی نہ دیتی تھی، اچانک اس میں ایسا انقلاب برپا ہوجاتا ہے کہ اس ناتوان اور کمزور چوزے کی حفاظت کی خاطر سینہ سپر ہوجاتی ہےاور جب تک چوزے کے لئے محافظ کی ضرورت ہے، اس میں یہ جذبہ باقی رہتی ہے؟!

کیا مرغی کے ایک انڈے کے متعلق غوروفکر، اس خالق کائنات کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں ہے کہ ﴿خَلَقَ فَسَوّٰى۝وَ الَّذِىْ قَدَّرَ فَهَدٰى﴾(۳۶)

اسی لئے امام - نے فرمایا:((أترى لها مدبر اً؟ قال: فأطرق ملياً، ثم قال: أشهد أن لا إله إلا اللّٰه وحده لا شريک له واشهد ان محمداً عبده ورسوله، وأنک إمام وحجة من اللّٰه على خلقه وانا تائب ممّا كنت فيه))(۳۷)

ہاں، وہی علم وقدرت اور حکمت جو مٹی کے گھپ اندھیرے میں بیج اور انڈے کے چھلکے کی تاریکی میں چوزے کو کسی ہدف اور مقصد کے لئے پروان چڑھاتا ہے، ماں کے پیٹ اور اس کے رحم کی تاریکیوں میں انسانی نطفے کو، جو ابتداء میں خوردبین سے نظر آنے والے جاندار سے بڑھ کر نہیں ہوتا اور اس میں انسانی اعضاء وجوارح کے آثار تک نہیں ہوتے، رحمِ مادر سے باہر زندگی بسر کرنے کے لئے تمام ضروریات زندگی سے لیس کرتا ہے۔

مثال کے طور پر جنین میں، ہڈیوں کو اپنی ذمہ داری نبھانے کے لئے مختلف شکل اور حجم میں بنایا، مختلف حرکات کے لئے عضلات کو قرار دیا، دماغ کی حیرت انگیز بناوٹ کے ذریعے مشعلِ ادراک کو روشن کیا اور دل کی فعالیت کے ذریعے جو ہر سال کروڑوں بار دھڑکتا ہے، حرارتِ حیات کو زندگی کے اس مرکز میں محفوظ فرمایا۔

انسانی جسم کی اس سادہ ترین ترکیب میں غوروفکر، عزیز وعلیم خدا کی تقدیر پر ایمان لانے کے لئے کافی ہے۔

مثال کے طور پر انسان کے منہ میں تین قسم کے دانت بنائے، پہلے ثنایا اس کے بعد انیاب، پھر اس کے بعد چھوٹے طواحن اور آخر میں بڑے طواحن کو قرار دیا(۳۸)اگر ثنایا، انیاب اور چھوٹے طواحن کو بڑے طواحن کی جگہ قرار دیا

جاتا تو دانتوں کی ترتیب میں یہ بگاڑ، غذا توڑنے اور چبانے سے لے کر اس چہرے کی بدصورتی اور خوبصورتی میں کیا کردار ادا کرتا؟!

اگر بھنویں جو آنکھوں کے اوپر ہیں، نیچے اور ناک کے سوراخ، نیچے کے بجائے اوپر کی سمت ہوتے تو کیا ہوتا؟!

زمین کی آبادی اور اس پر آباد کاری، چاہے کاشتکاری ہو یا مضبوط ترین عمارت یا نازک و دقیق ترین صنعت، سب کے سب، انگلی کی پوروں اور اس پر ناخنوں کے اگنے سے وابستہ ہیں۔

وہ کونسی حکمت ہے جس نے ناخن بنانے والا مادّہ، انسان کی غذا میں فراہم کیا، اسے حیرت انگیز طریقے سے ہضم کے مرحلے سے گزارا اور پھر رگوں میں داخل کر کے انگلیوں کی پوروں تک پہنچایا اور اس تخلیق کی غرض کو مکمل کرنے کے لئے گوشت اور ناخن میں پیوند کے ذریعے ان دونوں کے درمیان ایسا رابطہ برقرار کیا کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا نہایت طاقت فرسا کام ہے، لیکن غرض ومقصد حاصل ہونے کے بعد ان کو اس طرح ایک دوسرے سے جدا کر دیا کہ ناخن آسانی کے ساتھ کاٹے جا سکیں؟!

تعجب آور تو یہ ہے کہ جس غذا سے ناخن کا مادّہ اس سختی کے ساتھ تیار ہوا ہے، اسی غذا سے کمال لطافت کے ساتھ ایک صاف اور شفاف مادّہ، بینائی کے لئے بھی تیار ہوا ہے جو ہضم و جذب کے مراحل کو طے کرنے کے بعد آنکھ تک جا پہنچتا ہے۔

اگر ان دونوں کے طے شدہ تقسیم رزق میں کام الٹ جاتا اور ناخن آنکھ سے نکل آتا، جب کہ وہ صاف شفاف مادّہ آنکھوں کی بجائے انگلیوں کی پوروں تک جا پہنچتا، تو انسانی نظام زندگی میں کتنا بڑا خلل واقع ہو جاتا؟!

یہ علم وحکمت کے آثار کا سادہ ترین نمونہ ہے جو کسی دقت نظر کا بھی محتاج نہیں ﴿وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلاَ تُبْصِرُوْنَ﴾(۳۹) تو کہاں انسانی خلقت کے وہ عمیق ترین اسرار کہ جن کی تہہ تک رسائی کے لئے انسان اپنے علم کو جدید ترین آلات کی مدد سے کام میں لاتے ہوئے، سرجری اور اعضائے انسانی کی خصوصیات و کردار جیسے شعبوں میں اعلیٰ مہارت بھی حاصل کرے۔ ﴿اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْ اَنْفُسِھِمْ﴾(۴۰)

جی ہاں، اتنی زیادہ علمی کاوشوں کے بعد اب تک جس موجود کی جلد کی حکمت ہی واضح نہ ہو سکی ہو، اس کے باطن اور مغز میں کیسے عظیم اسرار پنہاں ہیں، جیسے ملائمات کو جذب کرنے والی شہوت اور ان کی حفاظت و نا ملائمات کو دفع کرنے والے غضب سے لے کر، ان دو کے عملی تعادل کے لئے عقل اور نظری تعادل کے لئے حواس کی ہدایت سے

سرفراز کیا گیا ہے﴿وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لاَ تُحْصُوْهَا﴾(۴۱)

حکمت کی ایسی کتاب کو علم وقدرت کے کون سے قلم سے پانی کے ایک قطرے پر لکھا گیا ہے؟! ﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ۔ خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ﴾(۴۲) ﴿يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلاَثٍ﴾(۴۳)

یہ کیسا علم اور کیسی قدرت وحکمت ہے کہ جس نے غلیظ و پست پانی میں تیرنے والے خوردبینی حیوان سے ایسا انسان خلق کیا ہے جس کی مشعلِ ادراک، اعماقِ آفاق وانفس کی جستجو کرے ﴿اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ۔ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ﴾(۴۴) اور زمین وآسمان کو اپنی قدرت وجولانِ فکر کا میدان قرار دے؟ ﴿اَ لَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً وَّمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلاَ هُدًى وَّلاَ كِتَابٍ مُّنِيْرٍ﴾(۴۵)

اس علم وقدرت اور رحمت وحکمت کے سامنے انسان، خود پروردگار عالم کے اس فرمان کے علاوہ کیا کہہ سکتا ہے کہ ﴿فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ﴾(۴۶) اور اس کے سوا کیا کر سکتا ہے کہ خاک پر گر کر اس کے آستانۂ جلال پر ماتھا رگڑ کر کہے: ((سبحن ربی الأعلی وبحمده))

اس آیت کریمہ ﴿سَنُرِيْهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾(۴۷) کے مطابق، آفاقِ جہاں میں بھی دقتِ نظر ضروری ہے کہ لاکھوں سورج، چاند وستارے جن میں سے بعض کا نور ہزاروں نوری سالوں کے بعد زمین تک پہنچتا ہے، جب کہ نور ہر سیکنڈ میں تقریباً تین لاکھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتا ہے، اور جن میں سے بعض کا حجم، زمین کے حجم سے کروڑوں گنا زیادہ ہے، ان سب کے درمیان اتنا گہرا انتظام اتنے دقیق حساب کے ساتھ برقرار کیا گیا ہے، ان میں سے ہر ایک کو اس طرح اپنے معین مدار میں رکھا گیا ہے اور قوتِ جاذبہ ودافعہ کے درمیان ایسا عمومی تعادل برقرار ہے کہ ان تمام سیاروں کے درمیان کسی قسم کے ٹکراؤ یا تصادم کا واقع ہونا، ناممکن ہے ﴿لاَ الشَّمْسُ يَنْبَغِيْ لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلاَ الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾(۴۸)

زمین کو، جو انسانی زندگی کا مرکز ہے، اس پر محیط ایک کروی فضاء کے ذریعے محفوظ کیا جس سے دن رات ہزاروں شہاب ٹکرا کر ختم ہو جاتے ہیں۔

سورج اور زمین کے درمیان اتنا مناسب فاصلہ برقرار کیا کہ معادن، نباتات، حیوانات اور انسانی زندگی کی

نشو نما کے اعتبار سے، روشنی وحرارت تمام شرائط کے مطابق موجود ہے۔

زمین کی اپنے مدار اور محور دونوں پر حرکت کو اس طرح منظم کیا کہ زمین کے زیادہ تر حصے میں طلوع وغروب اور دن ورات ہر آن موجود رہیں، آفتاب طلوع ہوتے ہی سورج کی روشنی وحرارت سے نظام زندگی کو روشنی اور گرمی ملے اور حصول رزق ومعاش کا بازار گرم ہوجائے اور غروب آفتاب کے ساتھ ہی آرام وسکون کے لئے رات کا اندھیرا، جو بقاءِ زندگی اور تجدید نشاط کے لئے ضروری ہے، اپنے ڈیرے ڈال دے تاکہ سورج کی مستقل حرارت یا اس کے مکمل انقطاع سے نظام حیات میں کوئی خلل واقع نہ ہو﴿وَ هُوَ الَّذِی جَعَلَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَنْ یَذَّکَّرَ﴾(۴۹) ﴿وَ مِنْ رَّحْمَتِهِ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْکُنُوا فِیهِ وَ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ﴾(۵۰) ﴿قُلْ أَرَأَیْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْکُمُ اللَّیْلَ سَرْمَداً إِلَی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ إِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَأْتِیکُمْ بِضِیَاءٍ أَفَلاَ تَسْمَعُونَ﴾(۵۱)

نور وظلمت اور روز وشب دونوں، آپس کے انتہا درجے کے تضاد واختلاف کے باوجود، مل کر ایک ہی ہدف ومقصد پورا کرنے میں مصروف عمل ہیں اور دوسری جانب جو کچھ زمین میں ہے اسے دن اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اسے رات کے وقت انسان کی نظروں کے سامنے رکھا گیا ہے تاکہ دن رات آسمانوں اور زمین کے ملک وملکوت انسان کی بصارت اور بصیرت کے سامنے موجود رہیں۔

انسان کے لئے کتابِ وجود کی دن رات ورق گردانی کی تاکہ وہ زمین وآسمان کے صفحے سے آیاتِ خدا کا مطالعہ کر سکے ﴿أَوَلَمْ یَنْظُرُوا فِی مَلَکُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ﴾(۵۲) ﴿وَکَذٰلِکَ نُرِیٓ إِبْرَاهِیمَ مَلَکُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لِیَکُونَ مِنَ الْمُوقِنِینَ﴾(۵۳)

وہ انسان جو ذہنِ بشر میں قوانین واسرارِ کائنات کے انعکاس کو علم وحکمت کا معیار وملاک سمجھتا ہو، کس طرح ممکن ہے کہ وہ مغز، ذہن اور دانشوروں کے تفکر کو بنانے والے، کائنات پر حکم فرما قوانین کو نافذ کرنے والے اور اسرارِ نظام ہستی کو وجود عطا کرنے والی ہستی کو فاقدِ علم وحکمت سمجھے، حالانکہ تمام مفکرین کے اذہان میں منعکس ہوجانے والے قوانین کائنات کی نسبت ان قوانین کے مقابلے میں جو اب تک مجہول ہیں، ایسی ہے جیسے قطرے کے مقابلے میں ایک سمندر ﴿وَمَا أُوتِیتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلاَّ قَلِیلاً﴾(۵۴)

اس بات پر کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ کتاب ہستی سے چند سطروں کی نقول تیار کر لینے والا تو علیم وحکیم ہو

لیکن خود کتاب وجود کا مصنف، اس نقل تیار کرنے والے کا خالق اور نقل کے وسیلے کو فراہم کرنے والا ہی بے شعور و بے ادراک ہو؟! یہی وجہ ہے کہ منکر کی فطرت بھی دانا وتوانا خالق کے وجود کی گواہی وشہادت دیتی ہے ﴿وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَنَّى يُؤْفَكُونَ﴾(۵۵) ﴿وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ﴾(۵۶)

منکرین خدا میں سے ایک شخص آٹھویں امام - کے پاس آیا تو امام - نے اس سے فرمایا: اگر تمھارا عقیدہ صحیح ہو، جب کہ ایسا نہیں ہے، تب بھی ہمیں نماز، روزہ، زکات اور اقرار سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ (کیونکہ دینی فرائض جو ایمان لانا، عمل صالح کرنا اور منکرات کو ترک کرنا ہے، روح کے اطمینان اور معاشرے کی اصلاح کا سبب ہیں اور اگر بالفرض عبث اور بے کار ہوں تب بھی، مبدا ومعاد کے احتمالی وجود کے مقابلے میں ان اعمال کے مطابق عمل کی تکلیف اور نقصان نہایت کم ہے، کیونکہ دفع شر اور بے انتہا خیر کثیر کو جلب کرنا، جو محتمل ہو، عقلاً ضروری ہے)۔

اس شخص نے کہا: جس خدا کے تم لوگ قائل ہو وہ کیسا ہے اور کہاں ہے؟

امام - نے فرمایا: اس نے این کو اَینیت اور کیف کو کیفیت عطا کی ہے۔ (وہی این ومکان اور کیف وکیفیت کا خلق کرنے والا ہے، جب کہ مخلوق کبھی بھی خالق کے اوصاف واحوال کا حصہ نہیں بن سکتی، کیوں کہ خالق میں مخلوق کے اوصاف موجود ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خالق مخلوق کا محتاج ہو جائے، اسی لئے خداوند متعال کو نہ کسی کیفیت یا مکانیت سے محدود کیا جاسکتا ہے، نہ کسی حس کے ذریعے محسوس کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی چیز کے ساتھ پرکھا جاسکتا ہے)۔

اس شخص نے کہا: بنا برایں اگر اسے کسی حس کے ذریعے محسوس نہیں کیا جاسکتا، تو اس کا وجود نہیں ہے۔

امام - نے فرمایا: جب تیری حس اس کے ادراک سے عاجز ہوئی تو تو اس کا منکر ہوا اور جب ہم نے حواس کو اس کے ادراک سے عاجز پایا تو ہمیں یقین ہوا کہ وہ ہمارا پروردگار ہے۔ (موجودات کو محسوسات تک منحصر سمجھنے والا اس بات سے غافل ہے کہ حس موجود ہے لیکن محسوس نہیں، بینائی اور شنوائی موجود ہے لیکن دیکھی اور سنی نہیں جاسکتی ہے، انسان ادراک کرتا ہے کہ غیر متناہی محدود نہیں ہے جب کہ ہر محسوس ہونے والی چیز محدود ومتناہی ہے؛ کتنے ہی ذہنی وخارجی موجودات ایسے ہیں جو حس ومحسوسات سے ماوراء ہیں، جب کہ وہ شخص موجود کو محسوس تک محدود خیال کرنے کی وجہ سے خالق حس ومحسوس کا منکر ہوا اور امام - نے اس شخص کی اسی حقیقت کی جانب ہدایت کی کہ حس ومحسوس، وہم وموہوم اور عقل ومعقول کا خالق حس، وہم اور عقل میں نہیں سما سکتا، کیونکہ حواس خمسہ جس چیز کا ادراک

کرتے ہیں اس پر محیط ہوتے ہیں جب کہ یہ حواس خدا کی مخلوق ہیں اور خالق اپنی مخلوق پر مکمل احاطہ رکھتا ہے، لہذا خالق حس ووہم وعقل کا خود ان کے دائرہ ادراک میں آجانا، جبکہ وہ ان پر محیط ہے اور محیط کا محاط میں تبدیل ہونا ممکن ہی نہیں ہے اور اگر خداوندِ متعال محسوس یا موہوم یا معقول ہو تو حواس سے درک ہونے والی اشیاء کے ساتھ شبیہ وشریک قرار پائے گا اور اشتراک کا لازمہ اختصاص ہے، جب کہ ترکیب مخلوق کی خصوصیت ہے، لہذا اگر خداوندِ متعال حس ووہم وعقل میں سما جائے تو مخلوق ہوا نہ کہ خالق)۔

اس نے پوچھا: خدا کب سے ہے؟

امام - نے فرمایا: تم یہ بتاؤ کہ کب نہ تھا؟ (خداوندِ متعال جو زمان وزمانیات اور مجردات ومادیات کے لئے قیوم ہے، اس کی ذات اقدس عدم، نابودی اور زمان ومکان سے مبرا ہے)

پھر اس نے امام - سے پوچھا: پس اس کے وجود کی دلیل کیا ہے؟

امام - نے آفاق والنفس میں موجود آیاتِ خدا کی ہدایت کی اور جسم کی بناوٹ میں تفکر وتدبر کے ذریعے اس نکتے کی طرف توجہ دلائی کہ اپنے وجود کی اس بناوٹ میں جن باریک نکات اور لطائفِ حکمت کا خیال رکھا گیا ہے، ان کے ذریعے اس خالق کے علم وحکمت کا اندازہ لگائے۔ اسے بادلوں، ہوا، سورج، چاند اور ستاروں کی حرکت میں غور وفکر کرنے کو کہا تا کہ اجرام فلکی میں موجود عجائبِ قدرت وغرائبِ حکمت میں تفکر وتدبر کے ذریعے عزیز وعلیم کی قدرت تک پہنچ سکے اور متحرکات آسمانی کی حرکت کے ذریعے تغیر وحرکت سے منزہ محرک پر ایمان لے آئے۔ (۵۷)

ج) مادّے وطبیعت میں موجود تغیر وتحول، اس مادّے وطبیعت سے برتر قدرت کی دلیل ہیں، کیونکہ مادّہ یا اس سے منسوب کسی بھی مادّی شے میں تاثیر، وضع ومحاذات کی محتاج ہے۔ مثال کے طور پر آگ جو حرارتِ جسم میں تاثیر رکھتی ہے یا چراغ جس کی شعاع فضا کو روشن ومنور کرتی ہے، جب تک آگ یا چراغ کی اس جسم یا فضا کے ساتھ خاص نسبت پیدا نہ ہو، ممکن ہی نہیں ہے کہ جسم اس آگ کی حرارت سے گرم یا فضا اس چراغ کے نور سے روشن ومنور ہو جائے، اور چونکہ معدوم کے ساتھ وضع اور نسبت کا برقرار ہونا محال ہے، للہذا ایسے موجودات جو پہلے مادہ وطبیعت میں نہ تھے اور بعد میں وجود پایا یا پائیں گے، ان موجودات میں مادہ وطبیعت کی تاثیر ممکن نہیں ہے۔ آسمان وزمین میں موجود ہونے والا ہر معدوم ایسی قدرت کے وجود کی دلیل ہے جس کو تاثیر کے لئے وضع ومحاذات کی

ضرورت نہیں ہے اوروہ ماورائے جسم وجسمانیات ہے﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئاً أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾(۵۸)

د) خدا پر ایمان انسان کی سرشت میں موجود ہے، کیونکہ فطری اعتبار سے انسان اپنے آپ کو ایک مرکز سے وابستہ اور محتاج پاتا ہے، لیکن اسبابِ معیشت کی مصروفیت اور خواہشات نفسانی سے لگاؤ اس وابستگی کے مرکز کو پانے میں رکاوٹ ہیں۔

جب بے چارگی اور ناامیدی اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے اور فکر کے تمام چراغوں کو بجھا ہوا اور تمام صاحبانِ قدرت کو عاجز پاتا ہے، اس کا سویا ہوا ضمیر جاگ اٹھتا ہے اور جس غنی بالذات پر فطرتا بھروسا کئے ہوئے ہے، اس سے بے اختیار مدد طلب کرتا ہے ﴿قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعاً وَّ خُفْيَةً لَئِنْ أَنْجَانَا مِنْ هٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ﴾(۵۹) ﴿وَ إِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوا إِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَ جَعَلَ لِلّٰهِ أَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِهِ﴾(۶۰) ﴿هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰى إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَّ فَرِحُوا بِهَا جَائَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَّ جَائَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشّٰكِرِينَ﴾(۶۱)

ایک شخص نے امام صادق - سے عرض کی: ((یا ابن رسول اللّٰہ! دلّنی علی اللّٰہ ما هو، فقد أکثر عليّ المجادلون و حیرونی. فقال له: یا عبد اللّٰہ ، هل رکبت سفینة قط؟ قال: نعم. قال: فهل کسر بک حیث لا سفینة تنجیک و لا سباحة تغنیک؟ قال: نعم، قال: فهل تعلق قلبک هنالک أن شیئاً من الأشیاء قادر علی أن یخلصک من ورطتک؟ قال: نعم، قال الصّادق -: فذلک الشيء هو اللّٰه القادر علی الإنجاء حیث لا منجي وعلی الإغاثة حیث لا مغیث))(۶۲)

جیسا کہ بے چارگی کے عالم میں دوسروں سے انقطاعِ مطلق کے دوران خداوندِ متعال کی یہ معرفت اور فطری ارتباط حاصل ہو جاتا ہے، اختیاری حالت میں بھی اسے علم وعمل جیسے دو پروں کے ذریعے پرواز کر کے حاصل کیا جاسکتا ہے:

اول) یہ کہ نورِ عقل کے ذریعے انسان، جہالت وغفلت کے پردوں کو پارا کرے اور دیکھے کہ موجودات کا وجود اور

ان کے کمالات ذاتی نہیں، بلکہ سب کے سب ذات قدوس کی جانب منتہی ہوتے ہیں ﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾(۶۳) ﴿هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ﴾(۶۴)

دوم) یہ کہ طہارت وتقویٰ کے ذریعے آلودگی اور رذایل نفسانی کی کدورت کو گوہر وجود سے دور کرے، کیونکہ خدا اور اس کے بندے کے درمیان جہالت وغفلت اور کدورت گناہ کے علاوہ کوئی دوسرا پردہ نہیں ہے کہ جسے علمی وعملی جہاد کے ذریعے پارا کرنا ضروری ہے ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾(۶۵)

چھٹے امام - نے ابن ابی العوجاء سے فرمایا: ((ويلک و کيف احتجب عنک من أراک قدرته في نفسک؟ نشؤک ولم تکن و کبرک بعد صغرک و قوتک بعد ضعفک و ضعفک بعد قوتک و سقمک بعد صحتک و صحتک بعد سقمک و رضاک بعد غضبک و غضبک بعد رضاک و حزنک بعد فرحک، و فرحک بعد حزنک و حبک بعد بغضک و بغضک بعد حبک و عزمک بعد إبائک و إباؤک بعد عزمک و شهوتک بعد کراهتک و کراهتک بعد شهوتک و رغبتک بعد رهبتک و رهبتک بعد رغبتک ورجائک بعد یاسک و یاسک بعد رجائک و خاطرک بما لم یکن في وهمک و عزوب ما انت معتقده من ذهنک و مازال یعد علي قدرته التي في نفسي التي لا أدفعها حتی ظننت أنه سیظهر فیما بیني و بینه))(۶۶)

توحید

توحید سے مراد ایسے خداوند عالم پر اعتقاد ہے جو یکتا ہے اور اجزاء وصفات کی ترکیب سے مبرا ہے، اس لئے کہ ہر مرکب، وجود کو اجزاء اور ان اجزاء کو ترکیب دینے والے کا محتاج ہے اور محال ہے کہ جو محتاج ہو وہ اپنے آپ یا کسی غیر کو وجود عطا کر سکے۔ خداوند متعال کی ذات وصفات میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔(۶۷)

اس سے متعلق بعض دلائل کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ تعدد الٰہ سے خداوند متعال میں اشتراک ضروری قرار پاتا ہے اس لئے کہ دونوں خدا ہیں، اور اسی طرح دونوں میں نقطۂ امتیاز کی ضرورت پیش آتی ہے تاکہ دوگانگی تحقق پیدا کرے اور وہ مرکب جو بعض نکات اشتراک اور بعض نکات امتیاز سے مل کر بنا ہو، ممکن ومحتاج ہے۔

۲۔ تعدد الہ کا کسی نقطۂ امتیاز کے بغیر ہونا محال ہے اور امتیاز، فقدانِ کمال کا سبب ہے۔ فاقدِ کمال محتاج ہوتا ہے اور سلسلۂ احتیاج کا ایک ایسے نکتے پر جاکر ختم ہونا ضروری ہے جو ہر اعتبار سے غنی بالذات ہو، ورنہ محال ہے کہ جو خود وجود کا محتاج وضرورت مند ہو کسی دوسرے کو وجود عطا کر سکے۔

۳۔ خدا ایسا موجود ہے جس کے لئے کسی قسم کی کوئی حد مقرر نہیں کیونکہ ہر محدود، دو چیزوں سے مل کر بنا ہے، ایک اس کا وجود اور دوسرے اس کے وجود کی حد اور کسی بھی وجود کی حد اس وجود میں فقدان اور اس کے منزلِ کمال تک نہ پہنچنے کی دلیل ہے اور یہ ترکیب، اقسامِ ترکیب کی بدترین قسم ہے، کیونکہ ترکیب کی باقی اقسام میں یا تو دو وجودوں کے درمیان ترکیب ہے یا بود ونمود کے درمیان ترکیب ہے، جب کہ ترکیب کی اس قسم میں بود ونبود کے درمیان ترکیب ہے!! جب کہ خدا کے حق میں ہر قسم کی ترکیب محال ہے۔ وہ ایسا واحد وجود ہے جس کے لئے کسی ثانی کا تصور نہیں، کیونکہ ثانی کا تصور اس کے لئے محدودیت اور متناہی ہونے کا حکم رکھتا ہے، لہٰذا وہ ایسا یکتا ہے کہ جس کے لئے کوئی ثانی نہ قابل تحقق ہے اور نہ ہی قابل تصور۔

۴۔ کائنات کے ہر جزء وکل میں وحدتِ نظم برقرار ہونے سے وحدت ناظم ثابت ہو جاتی ہے، کیونکہ جزئیاتِ انواع کائنات میں موجود تمام اجزاء کے ہر ہر جزء میں موجود نظم وترکیب اور پوری کائنات کے آپس کے ارتباط کے تفصیلی مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جزء وکل سب ایک ہی علیم، قدیر اور حکیم خالق کی مخلوق ہیں۔ جیسا کہ ایک درخت کے اجزاء کی ترکیب، ایک حیوان کے اعضاء وقوتوں کی ترکیب اور ان کا ایک دوسرے نیز چاند اور سورج سے ارتباط، اسی طرح منظومۂ شمسی کا دوسرے منظومات اور کہکشاؤں سے ارتباط، ان سب کے خالق کی وحدانیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ایٹم کے مرکزی حصے اور اس کے مدار کے گرد گردش کرنے والے اجزاء سے لے کر سورج ومنظومۂ شمسی کے سیارات اور کہکشاؤں تک، سب اس بات کی علامت ہیں کہ ایٹم، سورج اور کہکشاؤں کا خالق ایک ہی ہے ﴿وَ هُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلٰهٌ وَّ فِي الْأَرْضِ إِلٰهٌ وَّ هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ﴾(۶۸) ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۝ الَّذِي

جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَاءَ بِنَاءً وَّ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَّ أَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾(۶۹)

۵۔ چھٹے امام - سے سوال کیا گیا: صانع وخالق کائنات کا ایک سے زیادہ ہونا کیوں ممکن نہیں ہے؟ آپ - نے فرمایا: اگر دعویٰ کرو کہ دو ہیں تو ان کے درمیان شگاف کا ہونا ضروری ہے تاکہ دو بن سکیں، پس یہ شگاف تیسرا ہوا اور اگر تین ہو گئے تو پھر ان کے درمیان دو شگافوں کا ہونا ضروری ہے تاکہ تین محقق ہو سکیں، بس یہ تین پانچ ہو جائیں گے اور اس طرح عدد بے نہایت اعداد تک بڑھتا چلا جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگر خدا ایک سے زیادہ ہوئے تو اعداد میں خداؤں کی نا متناہی تعداد کا ہونا ضروری ہے۔(۷۰)

۶۔ امیر المؤمنین - نے اپنے فرزند امام حسن - سے فرمایا:((واعلم يابني أنه لو كان لربك شريك لأتتك رسله ولرأيت آثار ملكه وسلطانه ولعرفت أفعاله وصفاته))(۷۱)

اور وحدانیت پروردگار پر ایمان کا نتیجہ، عبادت میں توحید ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، چونکہ اس کے علاوہ سب عبد اور بندے ہیں﴿إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾(۷۲) غیر خدا کی عبودیت وعبادت کرنا ذلیل سے ذلت اٹھانا، فقیر سے بھیک مانگنا بلکہ ذلت سے ذلت اٹھانا اور گداگر سے گداگری کرنا ہے ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللّٰهِ وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ﴾(۷۳)

وحدانیت خداوند متعال پر ایمان، اور یہ کہ جو کچھ ہے اسی سے اور اسی کی وجہ سے ہے اور سب کو اسی کی طرف پلٹنا ہے، کو تین جملوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے ((لا إله إلا الله))، ((لا حول ولا قوة إلا بالله))، ﴿وَ إِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُوْرُ﴾(۷۴)

سعادت مند وہ ہے جس کی زبان پر یہ تین مقدس جملے ہر وقت جاری رہیں، انہی تین جملات کے ساتھ جاگے، سوئے، زندگی بسر کرے، مرے اور یہاں تک کہ ﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾(۷۵) کی حقیقت کو پالے۔

اور توحید پر ایمان کا اثر یہ ہے کہ فرد ومعاشرے کی فکر وارادہ ایک ہی مقصد وہدف پر مرتکز رہیں کہ جس سے بڑھ کر، بلکہ اس کے سوا کوئی دوسرا ہدف ومقصد ہے ہی نہیں ﴿قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ أَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى﴾(۷۶)۔ اس توجہ کے ساتھ کہ اشعۂ نفسِ انسانی میں تمرکز سے انسان کو ایسی قدرت مل جاتی ہے کہ وہ

خیالی نقطے میں مشق کے ذریعے حیرت انگیز توانائیاں دکھا سکتا ہے، اگر انسانی فکر اور ارادے کی شعاعیں اسی حقیقت کی جانب مرتکز ہوں جو مبدا ومنتہی اور ﴿نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ﴾(۷۷) ہے تو کس بلند واعلیٰ مقام تک رسائی حاصل کرسکتا ہے؟!

جس فرد ومعاشرے کی ﴿اِنِّی وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفاً وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ﴾(۷۸) کے مقام تک رسائی ہو، خیر وسعادت وکمال کا ایسا مرکز بن جائے گا جو تقریر وبیان سے بہت بلند ہے۔

عن أبی حمزة عن أبی جعفر -:((قال سمعته یقول: ما من شيء أعظم ثواباً من شهادة أن لا إله إلا الله، لأن الله عزوجل لا یعدله شی ولا یشرکه فی الأمر أحد))(۷۹)

اس روایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جیسا کہ کوئی بھی چیز خداوند متعال کی مثل وہمسر نہیں، اس ذات قدوس کے امر میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔کوئی عمل اس حقیقت کی گواہی کا مثل وہمسر نہیں جو کلمۂ طیبہ ((لا إله إلا الله)) کا مضمون ہے اور عمل کے ساتھ شایان شان جزا کے ثواب میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔

زبان سے ((لا إله إلا الله)) کی گواہی، دنیا میں جان ومال کی حفاظت کا سبب ہے اور دل سے اس کی گواہی آتش جہنم کے عذاب سے نجات کا باعث ہے اور اس کی جزا بہشت بریں ہے۔ یہ کلمہ طیبہ رحمت رحمانیہ ورحیمیہ کا مظہر ہے۔

چھٹے امام - سے روایت ہے کہ: خداوند تبارک وتعالی نے اپنی عزت وجلال کی قسم کھائی ہے کہ اہل توحید کو آگ کے عذاب میں ہرگز مبتلا نہ کرے گا۔(۸۰)

اور رسول خدا ﷺ سے منقول ہے:((ماجزاء من أنعم عزوجل علیه بالتوحید إلا الجنة))(۸۱)

جو اس کلمہ طیبہ کا ہر وقت ورد کرتا ہے، وہ حوادث کی جان لیوا امواج، وساوس اور خواہشات نفسانی کے مقابلے میں کشتیٔ دل کو لنگر ((لا إله إلا الله)) کے ذریعے ہلاکتوں کی گرداب سے نجات دلاتا ہے﴿اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِکْرِ اللّٰهِ اَلاَ بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾(۸۲)

کلمہ طیبہ کے حروف کو بالجہر اور بالاخفات دونوں طریقوں سے ادا کیا جاسکتا ہے کہ جامع ذکر جلی وخفی ہے اور اسم مقدس ((الله)) پر مشتمل ہے، کہ امیرالمؤمنین - سے منقول ہے کہ:((الله)) اسماء خدا میں سے بزرگترین اسم

ہے اور ایسا اسم ہے جو کسی مخلوق کے لئے نہیں رکھا گیا۔ اس کی تفسیر یہ ہے کہ غیر خدا سے امید ٹوٹ جانے کے وقت ہر ایک اس کو پکارتا ہے ﴿قُلْ أَرَأَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ اللَّهِ تَدْعُونَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۞ بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ﴾(۸۳)

ابو سعید خدری نے رسول خدا ﷺ سے روایت کی ہے کہ خداوند جل جلالہ نے حضرت موسیٰ سے فرمایا:

اے موسیٰ! اگر آسمانوں، ان کے آباد کرنے والوں (جو امر کی تدبیر کرنے والے ہیں) اور ساتوں زمینوں کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور ((لا إله إلا الله)) کو دوسرے پلڑے میں تو یہ دوسرا پلڑا بھاری ہوگا۔(۸۴) (یعنی اس کلمے کے مقابلے میں تمام مادّیات ومجرّدات سبک وزن ہیں)۔

عدل

خداوندِ متعال کی عدالت کو ثابت کرنے کے لئے متعدد دلائل ہیں جن میں سے ہم بعض کا تذکرہ کریں گے:

۱۔ ہر انسان، چاہے کسی بھی دین ومذہب پر اعتقاد رکھتا ہو، اپنی فطرت کے مطابق عدل کی اچھائی وحسن اور ظلم کی بدی و برائی کو درک کر سکتا ہے۔ حتی اگر کسی ظالم کو ظلم سے نسبت دیں تو اس سے اظہار نفرت اور عادل کہیں تو خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ شہوت وغضب کا تابع ظالم فرمانروا، جس کی ساری محنتوں کا نچوڑ نفسانی خواہشات کا حصول ہے، اگر اس کا واسطہ محکمہ عدالت سے پڑ جائے اور قاضی اس کے زور وزر کی وجہ سے اس کے کسی دشمن کا حق پامال کر کے اس ظالم کے حق میں فیصلہ دے دے، اگر چہ قاضی کا فیصلہ اس کے لئے باعث مسرت وخوشنودی ہے لیکن اس کی عقل وفطرت حکم کی بدی اور حاکم کی پستی کو سمجھ جائیں گے۔ جب کہ اس کے برعکس اگر قاضی اس کے زور وزر کے اثر میں نہ آئے اور حق وعدل کا خیال کرے، ظالم اس سے ناراض تو ہوگا لیکن فطرتاً وہ قاضی اور اس کے فیصلے کو احترام کی نظر سے دیکھے گا۔

تو کس طرح ممکن ہے کہ جس خدا نے فطرت انسانی میں ظلم کو برا اور عدل کو اس لئے اچھا قرار دیا ہو تا کہ اسے عدل کے زیور سے مزین اور ظلم کی آلودگی سے دور کرے اور جو ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾(۱)، ﴿قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ﴾(۲)، ﴿يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى﴾(۳) جیسی آیات کے مطابق عدل کا حکم دے وہ خود اپنے ملک وحکم میں ظالم ہو؟!

۲۔ ظلم کی بنیاد یا تو ظلم کی برائی سے لاعلمی، یا مقصد و ہدف تک پہنچنے میں عجز یا لغو وعبث کام ہے، جب کہ خداوندِ متعال کی ذات جہل، عجز اور سفاہت سے پاک ومنزہ ہے۔

لہذا، علم، قدرت اور لا متناہی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ خداوند متعال عادل ہو اور ہر ظلم وقبیح سے منزہ ہو۔

۳۔ ظلم نقص ہے اور خداوندِ متعال کے ظالم ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ اس کی ترکیب میں کمال ونقصان اور وجود وفقدان بیک وقت شامل ہوں، جب کہ اس بات سے قطع نظر کہ یہ ترکیب کی بدترین قسم ہے، کمال ونقص سے مرکب ہونے والا موجود محتاج اور محدود ہوتا ہے اور یہ دونوں صفات مخلوق میں پائی جاتی ہیں نہ کہ خالق میں۔

لہذا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تخلیق کائنات ﴿شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ هُوَ وَالْمَلاَئِكَةُ وَ أُوْلُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾(۴)، قوانین واحکام ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَ أَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾(۵) اور قیامت کے دن لوگوں کے حساب کتاب ﴿وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لاَ يُظْلَمُوْنَ﴾(۶) میں عادل ہے۔

عن الصادق -:((إنه سأله رجل فقال له :إن أساس الدين التوحيد والعدل، وعلمه كثير، ولا بد لعاقل منه، فاذكر ما يسهل الوقوف عليه ويتهيأ حفظه، فقال: أما التوحيد فأن لا تجوز على ربك ماجاز عليك، و أما العدل فأن لا تنسب إلى خالقك ما لامك عليه))(۷) اور ہشام بن حکم سے فرمایا: ((الا أعطيك جملة في العدل والتوحيد ؟ قال: بلى، جعلت فداك، قال: من العدل أن لا تتهمه ومن التوحيد أن لا تتوهمه))(۸)

اور امیر المومنین - نے فرمایا:((كل ما استغفرت الله منه فهومنك، وكل ما حمدت الله عليه فهومنه))(۹)

نبوت

نبوت عامہ

خالقِ حکیم کا وجود ثابت ہونے کے بعد نبوت اور نبی کے وجود کی ضرورت خود بخود ثابت ہے۔

سب سے پہلے ہم تعلیم وتربیتِ الٰہی کی ضرورت کو بیان کرتے ہیں:

ہدایت انبیاء کی انسانی ضرورت کو سمجھنے کے لئے خلقت انسان، ہدفِ خلقت اور اس ہدف ومقصد تک پہنچنے میں رکاوٹوں کی شناخت ضروری ہے اور جیسا کہ عنوان بحث سے معلوم ہے، ان مباحث کی عمیق تحقیق کو اس مختصر مقدمہ میں بیان نہیں کیا جاسکتا، لیکن ضروری حد تک بعض نکات پیش کئے جارہے ہیں:

اول: انسان میں مختلف شہوتیں اور خواہشات موجود ہیں اور انسانی زندگی، نباتاتی حیات سے شروع ہوکر، جو حیات کا ضعیف ترین مرتبہ ہے، عقل وشعور کے مرتبے تک جا پہنچتی ہے۔

انسان فطرت وعقل، محدود حوائج رکھنے والے جسم اور نا محدود خواہشات رکھنے والی روح سے مرکب ہے۔ ترقی اور بلندی میں فرشتوں سے بڑھ کر، جب کہ انحطاط وتنزل کے اعتبار سے جانوروں سے پست تر ہے۔

((عن عبدالله بن سنان، قال سالت أبا عبدالله جعفر بن محمد الصادق علیهما السلام، فقلت : الملائكة افضل ام بنو آدم ؟ فقال - : قال امیر المؤمنین علی بن ابی طالب - :ان الله عزوجل ركب فی الملائكة عقلاً بلا شهوة، وركب فی البهائم شهوة بلا عقل،و ركب فی بنی آدم كليهما، فمن غلب عقله شهوته فهو خير من الملائكة، ومن غلبت شهوته عقله فهو شر من البهائم))(۱)

اور اس تخلیق میں اتنی تازگی ہے کہ اس پیکر انسان کو ہر طرح سے مکمل کرنے اور اس میں حق جل وعلیٰ سے منسوب

روح پھونکنے کے بعد(۲)، اس مخلوق کو تمام موجودات کے مقابلے میں ممتاز وجود سے سرفراز کیا، جس کی عظمت اس آیۂ کریمہ ﴿ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾(۳) سے روشن ہے۔

انسان جانتا ہے کہ اسے محدود مادی زندگی کے لئے خلق نہیں کیا گیا، کیونکہ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ اوزار وآلات کو کام سے متناسب اور خلقت کی کیفیت کو ہدف ومقصد کے مطابق ہونا چاہئے۔

اگر انسان کی زندگی اسی دنیا تک محدود ہوتی تو شہوت،غضب اور ادراک حیوانی جو اس زندگی کے لذائذ کو جذب اور منفورات کو دفع کرتے ہیں، اس کے لئے کافی تھے۔ عقل، جو لامحدود علم اور اخلاقی وعملی کمالات سے آراستگی کی خواہاں وعاشق ہے اور ایک مقام ومرتبے کو پانے کے بعد بالاتر مقام ومرتبے کی پیاسی فطرت، کا انسان کو عطا کیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ لامحدود زندگی کے لئے خلق ہوا ہے، جیسا کہ حدیث نبوی میں ہے:((ما خلقتم للفناء بل خلقتم للبقاء و إنما تنقلون من دار إلی دار))(۴)

حکیم علی الاطلاق کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ جس استعداد کو مخلوقات کائنات میں قرار دیا ہے، اس قابلیت کو فعلیت تک پہنچانے کے عوامل بھی مہیا کرے، کیونکہ فعلیت کا روپ نہ دھارنے والی توانائی اور مطلوب کو حاصل نہ کرسکنے والی طلب بے کار ولغو ہیں۔

جس لامحدود علم وقدرت نے بیج کو پھلنے پھولنے کی استعداد وصلاحیت دی ہے اس نے پانی، خاک اور ہوا کو بھی خلق کیا ہے، جو بیج کے پھلنے پھولنے میں موثر عوامل ہیں۔ اگر انسانی نطفہ کو مختلف اعضاء وجوارح میں تبدیل ہونے کی استعداد وصلاحیت دی ہے تو اس استعداد کو فعلیت تک پہنچانے کے لئے رحمِ مادر کو خلق کیا ہے، لہذا کیسے ممکن ہے کہ عقل کا بیج، جس کا ثمر علم وعمل ہیں اور روح کی لطافت کو تو خلق کردے، جس میں علمی، عملی واخلاقی کمال اور خدا کی معرفت حاصل کرنے کی استعداد وصلاحیت ہو، لیکن عقل کے بیج کو ثمر تک پہنچنے اور استعدادِ روح کے فعلیت تک پہنچنے کے نہ تو وسائل مہیا کرے اور نہ ہی اس کی مقصدِ خلقت کی جانب ہدایت کرے؟!

آیا ممکن ہے کہ ﴿أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى﴾(۵) جیسے عمومی قانون سے انسان مستثنیٰ ہو؟!

یہیں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کو مقصدِ خلقت تک پہنچانے کے لئے الٰہی ہدایت ضروری ہے۔

دوم: انسان فطری طور پر اپنے خالق کی تلاش وجستجو میں ہے اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ اسے عدم سے وجود میں کون لایا ہے، یہ اعضاء وجوارح اسے کس نے عطا کئے ہیں اور نعمتوں کے دسترخوان پر اسے کس نے بٹھایا ہے، تاکہ بحکم

عقل، منعمِ حقیقی کی شکرگزاری جیسی ذمہ داری کو انجام دے۔

ادھر اس کی ذات مقدس کو اس سے کہیں بلند و بالا سمجھتا ہے کہ خود جو سراپا جہل و خطا اور ہویٰ و ہوس ہے، اس حس و محسوس، وہم و موہوم اور عقل و معقول کے خالق کے ساتھ اپنی مشکلات کے حل کے لئے سوال و جواب کا رابطہ برقرار کرے، جس کی عظمت و جمال و کمال لامتناہی اور ذات تمام نقائص و قبائح سے سبوح و قدوس ہے۔

اس مسئلے کے حل کے لئے اسے ایک ایسے واسطے کی ضرورت ہے جو خلق کے ساتھ رابطے کے لئے ضروری ہونے کے اعتبار سے انسانی صورت میں ہو اور قانون تناسب فاعل اور قابل کے اعتبار سے، جو خالق کے ساتھ رابطے کا لازمہ ہے، خطا سے پاک و منزہ عقل، ہویٰ و ہوس سے دور نفس اور الٰہی سیرت سے مزین ہو، تاکہ اس میں یہ صلاحیت آجائے کہ نور وحی سے منور ہو سکے اور ابواب معارف الٰہیہ کو انسانوں کے سامنے پیش کر سکے، اور انہیں عقل کی معرفتِ حق سبحانہ سے تعطیل کی تفریط اور خدا کو خلق سے تشبیہ جیسے افراط(۶) سے نجات دلاتے ہوئے دین قیم کی صراط مستقیم کی جانب ہدایت کرے:

﴿وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيماً فَاتَّبِعُوهُ وَلاَ تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾(۷)

سوم: انسان اپنی قدرت فکر کے ذریعے قوانین و اسرار خلقت کو کشف کرنے اور ان کو اپنی خدمت پر مامور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ ایسی ہوا و ہوس اور شہوت و غضب کا مالک ہے جو انسانی طبیعت کے خاصہ کے مطابق حد شکنی اور افزون طلبی پر کمر بستہ رہنے کی وجہ سے قناعت پذیر نہیں ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر زمین میں نیکی و برائی، انسان کی نیکی و برائی سے وابستہ ہے ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾(۸) بلکہ ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعاً مِنْهُ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾(۹) کے مطابق تو دوسرے سیاروں میں نیکی و برائی بھی انسان کی نیکی و برائی سے وابستہ ہے اور اس انسان کی اصلاح فقط ہدایت پروردگار عالم سے ممکن ہے، جو اعتدال فکری کو عقائد حقہ اور اعتدال روحی کو اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ کے ذریعے مہیا کرتی ہے۔

چہارم: مختلف ضروریات کی وجہ سے انسان کی زندگی معاشرے سے وابستہ ہے اور یہ وابستگی مختلف اور متقابل حقوق کا سبب بنتی ہے۔ ایک دوسرے کے حقوق کو تسلیم اور ادا کیے بغیر اجتماعی زندگی بقا کے قابل نہیں ہے اور یہ حقوق

اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک قانون ساز اور ان قوانین کا اجراء کرنے والا ہر قسم کے نقص و خطا سے محفوظ اور ذاتی مصلحتوں اور حق و انصاف کے سلسلے میں، ہر قسم کے انحراف سے پاک و منزہ نہ ہو اور یہ کام خدائی اصول و قوانین اور الٰہی نمائندوں کے بغیر ناممکن ہے:

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾(۱۰)

اب جب کہ ثابت ہو گیا کہ مبدا و معاد اور مقصدِ تخلیق کی جانب انسان کی ہدایت ضروری ہے اور یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ فکری و عملی اعتبار سے انسان کی کمال تک رسائی، خواہشات نفسانی کا تعادل اور انفرادی و اجتماعی حقوق کا حصول ایک لازمی امر ہے، یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ ان مقاصد کو وحی و نبوت کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے عملی جامہ پہنانا ناممکن نہیں۔ خطا سے آلودہ ذہن اور ہویٰ و ہوس کی قید میں جکڑے ہوئے ہاتھوں کے ذریعے یہ اہم مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے اور صرف تفکر و تدبر کے چراغوں سے انسانی فطرت میں موجود، مبہم نقاط روشن و واضح نہیں ہو سکتے۔

انسان جب اپنی مافوق العادہ استعداد، صلاحیت اور افکار کے ذریعے اسرار جہان کی تلاش و جستجو میں نکلا تو ناگہاں اس نے دیکھا کہ بدن کی عناصرِ اربعہ سے ترکیب اور چار مخالف طبیعتوں کو مختلف امراض و علل کی بنیاد سمجھنے کے بارے میں اس کا تصور غلط ہے اور خلقت کے بارے میں جو تانا بانا اس نے مٹی، پانی، ہوا، آگ اور ناقابل رسوخ و غیر پیوستہ آسمانی سیاروں سے بن رکھا تھا سب کھل کر رہ گیا اور یہ بات واضح و ثابت ہو گئی کہ وہ ترکیب بدن جیسی خود سے نزدیک ترین چیز اور اس کی صحت و امراض کے علل و اسباب سے ناواقف تھا اور جو کچھ نزدیک ترین آسمانی سیارے یعنی چاند کے بارے میں سمجھتا تھا سب غلط نکلا۔ آیا اس انسان کا یہ چراغ فکر، معرفت مبدا و معاد اور اسباب سعادت و شقاوت کی جانب اس کی ہدایت و راہنمائی کر سکتا ہے؟!

انسانی علم و دانش جو ایک ذرّے کے دل میں چھپے ہوئے اسرار کے ادراک سے عاجز ہے، انسان و جہان کے آغاز و انجام کے لئے ہادی، معرفت مبدا و معاد کے لئے مشکل کشاء اور اس کی دنیوی و اخروی سعادت کے لئے رہنما کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟!

((فبعث فيهم رسله و واتر إليهم أنبيائه ليستادوهم ميثاق فطرته و يذكروهم منسي نعمته و يحتجوا عليهم بالتبليغ و يثيروا لهم دفائن العقول و يروهم آيات المقدرة))(۱۱)

خصوصیات پیغمبر ﷺ

پیغمبر کی شخصیت میں بہت سی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ہم ان میں سے دو کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں:

ا۔ عصمت:

عصمتِ انبیاء علیہم السلام کو ثابت کرنے کے لئے بہت سے دلائل موجود ہیں۔ ہم ان میں سے دو کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہیں:

ا۔ ہر موجود کو جس کمال اور مرتبے تک پہنچنے کے لئے خلق کیا گیا ہے، اس کے لئے ایک قانون و طریقہ مقرر ہے اور سابقہ مباحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انسان کے اپنے مقصد تخلیق کے کمال کو پانے کے لئے جن قوانین و طور طریقوں کو مقرر کیا گیا ہے وہ ہدایتِ الٰہی اور دینِ حق ہے۔

اور اس کمال کا حصول انہی طور طریقوں پر مشتمل دین کی تبلیغ اور اسے عملی جامہ پہنانے سے وابستہ ہے، جب کہ پیغمبر، انہی طور طریقوں کے مطابق انسانی تعلیم و تربیت کا عہدیدار ہے۔ ان طور طریقوں کی تبلیغ و اجراء میں نقص واقع ہونے کا لازمہ، نقضِ غرض ہے۔ نیز وہ امر جو مبلغ وحی اور تربیت الٰہی کے مربی کے انحراف کا باعث ہو سکتا ہے وہ خطا یا ہوا و ہوس ہے۔ اور ان میں سے جو چیز بھی انحراف کا باعث ہو، مقصدِ تخلیق حاصل نہ ہوگا۔

ہدایت الٰہی کے کمال کو پانے کے لئے باکمال ہادی کی ضرورت اور سنت و دین الٰہی کی عصمت، کہ ﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهِ﴾(۱۲) کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دین وسنت الٰہی کا معلم و اجراء کنندہ معصوم ہو۔

---

(۱) جب کوئی عاقل و دانا ہستی کسی فعل کو کسی مخصوص مقصد اور ھدف کی خاطر انجام دے، لیکن جان بوجھ کر اس طرح سے انجام دے کہ جس سے اس کا وہ مقصد اور ھدف حاصل نہ ہو سکے تو یہ امر محال ہے۔ اور اسی کو اصطلاحاً نقض غرض کہا جاتا ہے۔ نیز اس کا وقوع پذیر ہونا۔ مذکورہ فرض کے مطابق۔ ممکن نہیں۔

۲۔ عقلی و نقلی نقطۂ نظر سے دین، انسان کو پاک و پاکیزہ زندگی عطا کرنے کے لئے آیا ہے ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنثَى وَ هُوَ مُؤمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (۱۳) پاک و پاکیزہ زندگی کے لئے ایمان و عمل صالح کو آب حیات قرار دیا گیا ہے، کہ جن سے مجموعۂ دین تشکیل پاتا ہے اور اس آب حیات کا راستہ پیغمبر کا وجود اطہر ہے۔ اگر راستہ آلودہ ہو تو آبِ حیات بھی آلودہ ہو جائے گا اور آلودہ پانی کے ذریعے پاک و پاکیزہ زندگی ثمر بار نہیں ہو سکتی۔

۳۔ چونکہ بعثت کی غرض پیغمبر کے امر و نہی کی اطاعت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، جب کہ خطا کار و گنہگار کی اطاعت جائز نہیں ہے، لہٰذا پیغمبر کا خطا و گناہ سے محفوظ نہ ہونا نقض غرض اور نتیجۂ بعثت کے بطلان کا سبب ہے۔

۴۔ اگر پیغمبر خطا و لغزش سے محفوظ و معصوم نہ ہو تو امت کو، تبلیغ وحی میں اس کی سچائی و صحت گفتار کا یقین حاصل نہیں ہو سکتا اور اگر گناہ سے محفوظ و معصوم نہ ہوا تو گناہ کی آلودگی کے باعث لوگوں کی نظروں سے گر جائے گا اور جس طرح عالمِ بے عمل و واعظ غیر متعظ کی گفتار کا انسانی نفوس پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اسی طرح غرض بعثت بھی حاصل نہ ہوگی۔

۵۔ خطا و گناہ کا سبب عقل و ارادے کی کمزوری ہے۔ وحی سے متصل عقلِ کامل جسے حق الیقین حاصل ہے اور تمام اشیاء کی حقیقت کو کما حقہ دیکھ رہا ہے، جس کا ارادہ خدا کے ارادے کے سوا کسی اور کے ارادے کو قبول نہیں کرتا۔ اس پیغمبر کے وجود میں گناہ و خطا کی ذرہ برابر گنجائش باقی نہیں رہتی۔

۲۔ معجزہ:

کوئی بھی دعویٰ قبول کرنے کے لئے دلیل ضروری ہے اور دلیل و مدعا کے درمیان اس طرح کا رابطہ برقرار ہونا چاہئے کہ دعوے کی حقانیت کا یقین، دلیل سے انفکاک و جدائی کے قابل نہ ہو۔

پیغمبر کا مدعا خداوندِ متعال کی طرف سے سفارتِ الٰہی ہے اور یہ مدعا خدا کی جانب سے ان کی گفتار کی تصدیق کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا اور معجزہ پیغمبر کے دعوے کے لئے خداوندِ متعال کی عملی تصدیق ہے، کیونکہ معجزہ در حقیقت وہ شے ہے جو بغیر کسی مادی واسطے کی وساطت کے، اسباب و مسببات پر محیط ارادے، سبب کی مسبب میں تاثیر اور مسبب میں سبب سے اثر پذیری کی وجہ سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔

جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے اور عقلی اعتبار سے اس کی تصدیق ممکن ہو اور اس دعوے کے ساتھ ما فوق الفطرت کام انجام دے تو یہ اس کی حقانیت کے قطعی گواہ ہیں، کیونکہ اگر حق پر نہ ہو تو اس کے ذریعے ما فوق الفطرت کاموں کا انجام پانا، جھوٹے کی تصدیق اور مخلوق کی گمراہی کا سبب ہے، جب کہ بارگاہ اقدس ربوبیت اس امر سے پاک و منزہ ہے۔

نبوت عامہ کی بحث کو ہم دو حدیثوں کے ذکر کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

((إنا لما اثبتنا أن لنا خالقا صانعا متعاليا عنا وعن جميع ما خلق وكان ذلك الصانع حكيماً متعالياً لم يجز أن يشاهده خلقه و لا يلامسوه فيباشرهم و يباشروه، و يحاجهم و يحاجوه، ثبت أن له سفراء في خلقه، يعبرون عنه إلى خلقه و عباده، و يدلونهم على مصالحهم و منافعهم و ما به بقاؤهم و في تركه فنائهم، فثبت الآمرون و الناهون عن الحكيم العليم في خلقه و المعبرون عنه جل و عزّ، و هم الأنبياء عليهم السلام و صفوته من خلقه، حكماء مؤدبين بالحكمة، مبعوثين بها، غير مشاركين للناس، على مشاركتهم لهم في الخلق و التركيب، في شيء من أحوالهم، مؤيدين من عند الحكيم العليم بالحكمة، ثم ثبت ذلك في كل دهر و زمان مما أتت به الرسل و الأنبياء من الدلائل و البراهين، لكيلا تخلو أرض الله من حجة يكون معه علم يدل على صدق مقالته و جواز عدالته))(۱۴)

امام جعفر صادق - نے نبوت کے بارے میں جن مباحث کو اس حدیث میں پیش کیا ہے، ان میں سے ہم بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

بعثت انبیاء کی ضرورت سے متعلق دلیل کو جملہ ((وكان ذلك الصانع حكيما متعاليا) سے ((يدلونهم)) تک ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ انسان سے سرزد ہونے والی ہر حرکت و سکون اور فعل و ترک دنیا و آخرت کے اعتبار سے یا تو اس کے لئے نفع بخش ہے یا نقصان دہ اور یا نہ تو نافع ہے اور نہ ہی مضر۔ بہر حال انسان کے لئے اپنی دنیا و آخرت کے نفع و نقصان اور مصلحت و مفسدہ کو جاننا ضروری ہے اور ان امور کی معرفت انسان کو فقط اور فقط اسی ذات کی جانب سے ودیعت ہو سکتی ہے جو انسان کی دنیوی اور اُخروی زندگی پر اثر انداز ہونے والی تمام حرکات و سکنات اور فعل و ترک پر محیط ہو۔ وہ ذات جو دنیا، آخرت اور انسان کی خالق ہے۔ اور خالق کی حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ہدایت کا انتظام کرے۔ اب چونکہ اس کی دلالت و ہدایت اس کے عالی مرتبت ہونے کی وجہ سے کسی عادی

سبب کی وساطت کے بغیر ممکن نہیں ہے لہٰذا الٰہی نمائندوں کا ہونا ضروری ہے کہ ((یدلونهم علی مصالحهم ومنا فعهم ومابه بقاؤهم وفی ترکه فنائهم))

مذکورہ بالا دلیل، فلاسفہ کی برہان نبوت پر واضح فوقیت رکھتی ہے. کیونکہ اس دلیل میں انسان کی تمام مصلحتوں اور منافع کو عالم وجود کے تمام مراحل میں خاص توجہ دی گئی ہے جب کہ فلاسفہ کی برہان نبوت میں فقط انسان کے مدنی الطبع ہونے اور اجتماعی معاملات اور سماجی روابط میں عدل کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

مخلوق کے ساتھ مشترک اور ان سے ممتاز ہونے کے اعتبار سے انبیاء علیہم السلام کے استثنائی وجود اور جن چیزوں میں اشتراک اور جن کی بنیاد پر امتیاز ہے، ان کی طرف جملہ ((غیر مشارکین للناس، علی مشارکتهم لهم فی الخلق والترکیب، فی شیء من احوالهم)) میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اور جملہ ((صفوة من خلقه)) میں باقی مخلوق سے انبیاء کے برگزیدہ ہونے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس برگزیدہ خلقت کے ذریعے خالق ومخلوق کے درمیان مقام وساطت پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ عالی ودانی کے درمیان رابطہ برقرار کر سکے۔

اور جملہ ((یعبرون عنه)) میں موجود'' خدا سے تعبیر'' کے لفظ کی لطافت، پیغمبر کے مقام ومنزلت کو روشن کرتی ہے کہ وہ زبان کی مانند، جو ما فی الضمیر کی بیان گر ہے، مقاصدِ خداوندمتعال کو مخلوق تک پہنچاتا ہے اور اس مقام ومنزلت کے لئے تقدس وعصمت پیغمبر کا ہونا ضروری ہے۔

جملہ ((یکون معه علم یدل علی صدق مقالته وجواز عدالته)) میں اثباتِ نبوت کے لئے ضرورتِ معجزہ کی دلیل کو بیان فرمایا اور چونکہ منشاء نبوت حکیم علی الاطلاق کی حکمت ہے اور اس کا ثمر بھی حکمت ہے ﴿قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ﴾(۱۵)، ﴿اُدْعُ إِلٰى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ﴾(۱۶) انبیاء کی حکمتِ نظری اور حکمت عملی میں برتری کی جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ اس حکمت نظری کی بنیاد فکر اور یہ حکمت عملی ((یعبرون عنه)) اور ((ومن عند الحکیم العلیم)) کے تقاضے کے مطابق نور کا ایسا چراغ ہے جو کسی انسانی تعلیم وتربیت کے بغیر نور السماوات والأرض سے مرتبط ہونے کی وجہ سے منور اور روشن ہے ﴿يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ﴾(۱۷)

اور اس کے ساتھ کہ یہ جملہ ارشاد فرمایا ((حکماء مؤدبین بالحکمة))، تھوڑے فاصلے کے بعد ہی یہ فرمایا ((مؤیدین من عند الحکیم العلیم بالحکمة))۔ پہلے جملے میں حکمت کے ذریعے مؤدّب اور مہذب اور دوسرے جملے میں حکمت کے ذریعے تائید کا ذکر ہے، اور حکمتِ انبیاء اور مکتبِ وحی کا حدوث وبقاء کے اعتبار سے

بارگاہِ حکیم وعلیم سے رابطہ، فکرِ انسانی پر اس حکمت کی برتری کو اس حد تک روشن کر دیتا ہے جو ما عند اللہ اور ما عند الناس کے درمیان کی حد ہے۔

اور جملہ ((وکان ذلک الصانع حکیما)) اور انبیاء کی ((حکماء مؤدبین بالحکمة مبعوثین بها)) سے توصیف اس مطلب کی بیان گر ہے کہ نبوت کی علت فاعلی اور علت غائی، حکمت ہے، اور مبدأ و منتہیٰ کے درمیان حد وسط بھی حکمت ہی ہے ﴿یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ الْمَلِکِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ۞هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیِّیْنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ آیَاتِهٖ وَ یُزَکِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَ اِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلاَلٍ مُّبِیْنٍ﴾ (۱۸)

کلام امام - کے اشارات ولطیف نکات میں دوسرے بیش قیمت مباحث موجود ہیں، لیکن اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے ذکر سے صرف نظر کرتے ہیں۔

امام ہشتم حضرت علی بن موسیٰ الرضا - نے نبوت کی بحث میں ارشاد فرمایا: ((فإن قال: فلم وجب عليهم معرفة الرسل و الإقرار بهم والإذعان لهم بالطاعة؟ قيل: لأنه لما لم يكن فى خلقهم و قولهم و قواهم ما يكملون لمصالحهم وكان الصانع متعالياً عن أن يرى، وكان ضعفهم و عجزهم عن إدراكه ظاهراً لم يكن بد من رسول بينه و بينهم معصوم يؤدى إليهم أمره و نهيه و أدبه و يقفهم على ما يكون به إحراز منافعهم و دفع مضارهم إذ لم يكن فى خلقهم ما يعرفون به ما يحتاجون إليه من منافعهم و مضارهم)) (۱۹)

نبوت خاصّہ

چونکہ پیغمبر اکرم ﷺ کی رسالت رہتی دنیا تک کے لئے ہے اور آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ آنحضرت ﷺ کا معجزہ بھی ہمیشہ باقی رہے۔

دوسرے یہ کہ آپ ﷺ کی بعثت کا دور کلام میں فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے مقابلے کا دور تھا اور اس معاشرے میں شخصیات کی عظمت ومنزلت، نظم ونثر میں فصاحت و بلاغت کے مراتب کی بنیاد پر طے ہوتی تھی۔

ان ہی دو خصوصیات کے سبب قرآن مجید، مختلف لفظی اور معنوی اعتبارات سے حضور اکرم ﷺ کی نبوت و رسالت کی دلیل قرار پایا۔ جن میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں:

ا۔قرآن کی مثل لانے سے انسانی عجز:

پیغمبر اکرم ﷺ نے ایسے زمانے اور ماحول میں ظہور فرمایا جہاں مختلف اقوام کے لوگ گوناگوں عقائد کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ کچھ تو سرے سے مبدأ متعال کے منکر اور مادہ پرست تھے اور جو ماوراء مادہ وطبیعت کے قائل بھی تھے تو، ان میں سے بھی بعض بت پرستی اور بعض ستارہ پرستی میں مشغول تھے۔ باقی جو ان بتوں اور ستاروں سے دور تھے وہ مجوسیت، یہودیت، یا عیسائیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

دوسری جانب شہنشاہ ایران اور ہرقل روم کمزور اقوام کی گردنوں میں استعمار و استحصال کے طوق ڈالے ہوئے تھے یا پھر جنگ و خونریزی میں سرگرم تھے۔

ایسے دور میں پیغمبر اسلام ﷺ نے غیب پر ایمان اور توحید کے پرچم کو بلند کر کے کائنات کے تمام انسانوں کو پروردگار عالم کی عبادت اور کفر وظلم کی زنجیریں توڑنے کی دعوت دی۔ ایران کے کسریٰ اور قیصر روم سے لے کر غسان و حیرہ کے بادشاہوں تک، ظالموں اور متکبروں کو پروردگار عالم کی عبودیت، قبولِ اسلام، قوانین الٰہی کے سامنے تسلیم اور خود کو حق و عدالت کے سپرد کرنے کی دعوت دی۔

مجوس کی ثنویت، نصاریٰ کی تثلیث، یہود کی خدا اور انبیاء علیہم السلام سے ناروا نسبتوں اور جاہلیت کی ان غلط عادات ورسوم سے، جو آباء واجداد سے وراثت میں پانے کے سبب جزیرۃ العرب کے لوگوں کے رگ و پے میں سما چکی تھیں، مقابلہ کیا اور تمام اقوام وامم کے مدمقابل اکیلے قیام فرمایا۔

باقی معجزات کو چھوڑ کر معجزۂ قرآن کو اثبات نبوت کی قاطع دلیل قرار دیا اور قرآن کو چیلنج بناتے ہوئے بادشاہوں، سلاطین، نیز علمائے یہود اور عیسائی راہبوں جیسی طاقتوں اور تمام بت پرستوں کو مقابلے کی دعوت دی ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوْا شُهَدَآئَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ﴾(۲۰)

واضح ہے کہ عوام الناس کا اپنے عقائد میں تعصب، علماء مذاہب کی اپنے پیروکاروں کے ثابت قدم رہنے پر سختی اور سلاطین کے لئے رعایا کی بیداری کا خطرہ ہوتے ہوئے اگر ان کے بس میں ہوتا تو قرآن کا جواب لانے میں ہرگز سستی نہ کرتے۔

دانشوروں، شعراء، اور اہل سخن کے ہوتے ہوئے جو فصاحت و بلاغت کے ماہرین تھے اور بازار عکاظ کو ان

کے مقابلوں کا میدان قرار دیا جاتا تھا اور ان مقابلوں میں جیتنے والوں کے اشعار کو خانہ کعبہ کی دیوار پر بطور افتخار آویزاں کیا جاتا تھا، اگر ان میں مقابلے کی قدرت ہوتی تو آیا اس مقابلے میں، جس میں ان کے دین و دنیا کی ہار جیت کا سوال تھا، کیا کچھ نہ کرتے؟

آخر کار آپ ﷺ کی گفتار کو جادو سے تعبیر کرنے کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہ کر سکے ﴿إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ (۲۱)

اور یہی وجہ تھی کہ جب ابوجہل نے فصحاء عرب کے ملجا و مرجع، ولید بن مغیرہ سے قرآن کے متعلق رائے دینے کی درخواست کی تو کہنے لگا: ((فما أقول فيه فوالله ما منكم رجل أعلم بالأشعار مني ولا أعلم برجزه مني ولا بقصيده ولا بأشعار الجن، والله ما يشبه الذي يقول شيئاً من هذا، و والله إن لقوله لحلاوة و إنه ليحطم ما تحته و أنه ليعلو و لا يعلى. قال ابوجهل: والله لا يرضى قومك حتى تقول فيه، قال: فدعني حتى أفكرّ فيه، فلمّا فكر، قال: هذا سحر يأثره عن غيره)) (۲۲)

ولید بن مغیرہ کا یہ بیان اعجاز قرآن کے مقابلے میں شکست تسلیم کرنے کی دلیل ہے، کیونکہ جادو کی انتہا بھی عادی اسباب پر ہے جو انسان کی قدرت سے باہر نہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ اس زمانے میں جزیرۃ العرب اور اس کے ہمسایہ ممالک میں جادوگروں اور کاہنوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو جادو اور علم نجوم میں کمال کی مہارت رکھتے تھے۔ اس کے باوجود پیغمبر اکرم ﷺ کا قرآن کے ذریعے چیلنج کرنا اور ان سب کا قرآن کے مقابلے میں عاجز ہونا تاریخ کے اوراق میں ثبت ہے، لہذا قرآن سے مقابلے کے بجائے آنحضرت ﷺ کو مال و مقام کا لالچ دیا گیا اور جب ان کی اس سعی و کوشش نے بھی اپنا اثر نہ دکھایا تو آپ ﷺ کی جان کے درپے ہو گئے۔

۲۔ ہدایتِ قرآن

ایسے دور میں جب ایک گروہ کا ماوراء الطبیعت پر اعتقاد ہی نہ تھا بلکہ ادارک سے عاری اور بے شعور مادّے کو عالم وجود کے حیرت انگیز نظام کے انتظام و انصرام کا مالک سمجھتے تھے، جب کہ ماوراء الطبیعت پر اعتقاد رکھنے والے گوناگوں بتوں کی صورت میں اپنے اپنے معبودوں کی پوجا کرتے تھے اور آسمانی ادیان کے معتقد، تحریف شدہ کتب کے مطابق، خالق کو اوصافِ خلق سے متصف خیال کرتے تھے۔ ایسا ماحول جہاں تاریخ، عوام کے شدید فکری، اخلاقی

اور علمی انحطاط کی گواہ ہے، وہاں ایک ایسے فرد نے قیام کیا جس نے نہ کہیں سے پڑھا اور نہ کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا تھا، لیکن گمراہی کی ہر تاریک کھائی کے مقابلے میں ہدایت کی عظیم شاہراہ ترسیم کی۔ انسان کو ایسے پروردگار عالم کی عبادت کی دعوت دی جو ہر قسم کے نقص سے پاک ومنزہ اور تمام کمال و جمال اسی کے وجود سے ہیں، ساری تعریفیں اسی کے لئے مخصوص ہیں، جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، اس کی ذات اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ اس کے لئے کوئی حد معین کی جائے یا اوصاف میں سے کوئی صفت بیان کی جا سکے ((سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا إلہ إلا اللّٰہ واللّٰہ أکبر)(۴۳)

ان ایام میں جب عدد ومعدود کے خالق اور اولاد و ازواج پاک ومنزہ ذات سے ترکیب، تثلیث، احتیاج اور تولید نسل کی نسبت دینے کے ساتھ ساتھ اس کا ہمسر تصور کیا جاتا تھا، قرآن نے اس کی ذات کو ان تمام اوہام سے پاک ومنزہ قرار دیتے ہوئے پروردگار عالم کی واحدانیت کا اعلان فرمایا کہ خدا کی ذات ہر قسم کی عقلی، وہمی اور حسی ترکیب سے منزہ ہے، وہ ہر شخص اور ہر شے سے بے نیاز ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ ہر چیز وہر شخص محتاج ہے، اس کی مقدس ذات میں تولید نسل کو عقلاً وحساً کسی بھی معنی کے اعتبار سے گنجائش نہیں، تمام موجودات اس کی قدرت وارادے سے موجود ومخلوق ہیں۔ ذات، صفات اور افعال میں اس کی کوئی مثال نہیں۔

اگر چہ قرآن میں پروردگار عالم کی معرفت، اعلیٰ صفات اور اسماء حسنیٰ سے متعلق ایک ہزار سے زیادہ آیات موجود ہیں، لیکن ان میں سے ایک سطر میں تدبر وتفکر ہی ہدایت کی عظمت کو واضح وروشن کر دیتا ہے ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ۔ اللّٰهُ الصَّمَدُ۔ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ۔ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾

کلام اہل بیت علیہم السلام، جو معرفت کے خزانوں کی کنجی ہے، یہاں ان میں سے دو حدیثیں نقل کرتے ہیں:

۱۔ امام جعفر صادق - فرماتے ہیں: ((إن اللّٰہ تبارک وتعالی خلو من خلقه وخلقه خلو منه وکل ما وقع علیه اسم شیء ما خلا اللّٰہ عزوجل فهو مخلوق، واللّٰہ خالق کل شیء، تبارک الذي لیس کمثله شيء)) (۴۴)

۲۔ امام باقر - فرماتے ہیں: ((کلما میزتموہ بأوهامکم في أدق معانیه، مخلوق مصنوع مثلکم مردود إلیکم))(۴۵)

آسمانی کتاب، جن پر کروڑوں یہود ونصاریٰ کے عقائد کی بنیاد ہے، کے عہد عتیق وجدید کا مطالعہ کرنے کے بعد

معارف الٰہیہ سے متعلق ہدایت قرآن کی عظمت آشکار ہوتی ہے۔ اس مقدمے میں نمونے کے طور پر چند ایک کا ذکر کرتے ہیں:

الف: سفر تکوین (پیدائش) باب دوم: ''اور ساتویں دن اسے اپنے تمام کاموں سے فراغت ملی۔ اس نے ساتویں دن اپنے تمام کاموں کو انجام دینے کے بعد فرصت پائی۔ پھر خدا نے ساتویں دن کو مبارک اور پاکیزہ قرار دیا کیونکہ اس دن اس نے اپنے تمام امور سے فراغت کے بعد فرصت پائی......خداوند خدا نے آدم کو حکم دیتے ہوئے فرمایا: بغیر کسی روک ٹوک کے باغ کے تمام درختوں سے کھا سکتے ہو، لیکن نیک و بد کی معرفت کے درخت سے ہرگز نہ کھانا، کیونکہ جس دن اس سے کھاؤ گے یقیناً مر جاؤ گے۔''

ب: سفر تکوین (پیدائش) باب سوم: ''خداوند خدا کے خلق شدہ صحرائی حیوانات میں سے سانپ سب سے زیادہ ہوشیار تھا، اس نے عورت سے کہا: کیا واقعی خدا نے تمہیں باغ کے تمام درختوں سے کھانے سے منع کیا ہے؟ عورت نے سانپ سے کہا: ہم باغ کے باقی درختوں سے تو پھل کھا سکتے ہیں سوائے اس درخت کے جو باغ کے درمیان میں ہے، خدا نے فرمایا ہے کہ اس درخت سے نہ کھانا اور اسے چھونا بھی نہیں ورنہ مر جاؤ گے۔ سانپ نے کہا: ہرگز نہ مرو گے، بلکہ خدا جانتا ہے جس دن تم نے اس سے کھا لیا تمہاری آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ جائیں گے اور خدا کی طرح تمہیں بھی نیک و بد کی معرفت حاصل ہو جائے گی۔ جب عورت نے دیکھا کہ اس درخت سے کھانا اچھا ہے جس کی دید خوش نما و دلپذیر ہے اور جو معرفت بڑھانے والا ہے، پس اس درخت سے پھل توڑ کر خود بھی کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا، جو اس نے کھا لیا۔ جب وہ کھا چکا، اس وقت دونوں کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ گئے دونوں نے دیکھا کہ ان کے جسم عریاں ہیں انہوں نے انجیر کے پتوں کو آپس میں جوڑ کر اپنے جسم کو ڈھانپنے کا سامان فراہم کیا اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز سنی جو نسیم صبح کے چلنے کے وقت باغ میں خراماں خراماں ٹہل رہا تھا۔ آدم اور اس کی بیوی نے خود کو خداوند خدا کی نظروں سے اوجھل کر کے خود کو باغ کے درختوں کے درمیان چھپا لیا۔ خداوند خدا نے آدم کو آواز دی اور کہا: تم کہاں ہو؟ آدم نے کہا: میں باغ میں تمہاری آواز سن کر چوں کہ عریاں ہوں، ڈر گیا ہوں اور خود کو چھپا لیا ہے۔ کہا: کس نے تمہیں آگاہ کیا کہ تم عریاں ہو؟ آیا تمہیں جس درخت سے کھانے کو منع کیا تھا، تم نے اس سے کھا لیا؟......''

اسی باب کی بائیسویں آیت میں ہے: ''اور خداوند خدا نے کہا: بے شک انسان نیک و بد کی معرفت کے بعد

ہماری مانند ہو گیا ہے۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ ہاتھ بڑھا کر درختِ حیات سے بھی کھا لے اور ہمیشہ باقی رہے۔"

باب ششم کی چھٹی اور ساتویں آیت میں یہ مذکور ہے: "اور خداوند زمین پر انسان کی خلقت سے پشیمان اور اور اپنے دل میں غمگین ہوا، خداوند نے کہا: انسان کو جو خلق کیا ہے اس زمین کو انسان، حیوانات، حشرات الارض اور پرندوں کے وجود سے پاک کردوں، کیونکہ انہیں خلق کر کے پشیمان ہوں۔"

اب ہم ان آیات میں سے بعض نکات کی جانب اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ پروردگار عالم نے انسان کو خلق کیا ہے اور اسے عقل عطا کی ہے تا کہ وہ اچھے اور برے کی پہچان کر سکے۔ اس نے عقل کو علم و معرفت کے لئے پیدا کیا ہے، کیسے ممکن ہے کہ وہ اسے اچھے اور برے کی پہچان سے روک دے؟!

جب کہ ہدایت قرآن یہ ہے ﴿ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لاَ يَعْلَمُوْنَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُوْلُوْاالْأَلْبَابِ ﴾(۲۶)، ﴿إِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لاَ يَعْقِلُوْنَ﴾(۲۷)

علم، معرفت، تعقل، تفکر، اور تدبر کے بارے میں آیات قرآن اتنی زیادہ ہیں کہ اس مختصر مقدمے میں ذکر کرنا ممکن نہیں ہے۔

۲۔ جو یہ کہے کہ اگر اس نیک و بد کے درخت سے کھایا تو مر جاؤ گے جب کہ آدم اور اس کی زوجہ کھاتے ہیں اور نہیں مرتے، یا تو جانتا تھا کہ نہیں مریں گے، لہذا جھوٹا ہے، یا نہیں جانتا تھا پس جاہل ہوا۔ کیا جھوٹا اور جاہل، "خداوند" کے نام کا حق دار ہو سکتا ہے؟!

اس سے زیادہ عجیب یہ کہ سانپ، آدم اور اس کی زوجہ کو نیک و بد کی معرفت کے درخت سے کھانے کے لئے ہدایت کر کے، خدا کے جھوٹ کو ان پر آشکار اور بناوٹی خدا کے فریب اور دھوکے بازی کو نمایاں کرتا ہے؟!

لیکن خدا کے علم سے متعلق قرآن کا نمونہ یہ ہے ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلاَ يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلاَّ بِمَا شَاءَ﴾ (۲۸)، ﴿وَلاَ يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ﴾(۲۹)، ﴿إِنَّمَا إِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْماً﴾(۳۰)، ﴿قُلْ أَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ كَانَ غَفُوْراً رَّحِيْماً﴾(۳۱)، ﴿ لاَ جَرَمَ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ﴾(۳۲)، ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾(۳۳)

۳۔ ایسا موجود جو خود محدود ہو اور جو آدم کو باغ کے درختوں میں گم کر دے اور کہے: کہاں ہو؟ تا کہ آدم کی آواز

سن کر اسے ڈھونڈے، باغ کے درخت جس کے دیکھنے میں مانع ہوں، وہ رب العالمین، عالم السر والخفیات، خالق کون ومکان اور زمین وآسمان پر محیط کیسے ہوسکتا ہے؟!

جب کہ اس کے مقابلے میں ہدایتِ قرآن کا نمونہ یہ ہے ﴿وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لاَ يَعْلَمُهَا إِلاَّ هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلاَّ يَعْلَمُهَا وَلاَ حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الأَرْضِ وَلاَ رَطْبٍ وَلاَ يَابِسٍ إِلاَّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ﴾(۳۴)

۴۔ انجیل کی مذکورہ بالا آیات خدا کی توحید اور تقدیس کی جانب ہدایت کرنے کے بجائے کہ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾(۳۵)، اس کی ذات میں شرک اور تشبیہ پر دلالت کرتی ہیں اور کہتی ہیں: "......خدا نے کہا: نیک وبد کی معرفت حاصل کر کے انسان یقیناً ہماری طرح ہوگیا ہے......"

۵۔ پروردگار عالم کا تخلیق آدم سے پشیمان ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے کام کے انجام سے جاہل تھا۔ کیا پروردگار عالم کو جاہل سمجھنا، کہ جس کا لازمہ محدودیتِ ذات ومخلوقیتِ خالق اور نورِ علم وظلمتِ جہل کی حق متعال کے ساتھ ترکیب ہے، انسان کو خدا کی جانب ہدایت کرنے والی آسمانی کتاب سے ممکن ہے؟!

جب کہ ہدایت قرآن یہ ہے کہ ﴿أَلاَ يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾(۳۶) ﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلاَئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ﴾(۳۷)

۶۔ پروردگار عالم سے حزن وملال کو منسوب کیا جو جسم، جہل اور عجز کا لازمہ ہیں اور اس بارے میں ہدایت قرآن یہ ہے ﴿سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ٭ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ٭ هُوَ الأَوَّلُ وَالآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾(۳۸)

اور اسی موضوع سے متعلق عیسائیوں کے بعض مخصوص عقائد مختصراً درج ذیل ہیں:

۱۔ رسالۂ اول یوحنا رسول باب پنجم: "جس کسی کا عقیدہ یہ ہو کہ عیسیٰ مسیح ہے، خدا کا بیٹا ہے اور جو والد سے محبت کرے اس کے بیٹے سے بھی محبت کرتا ہے......کون ہے جو دنیا پر غلبہ حاصل کرے مگر وہ جس کا عقیدہ یہ ہو کہ عیسیٰ خدا کا بیٹا ہے۔ یہ وہی ہے جو پانی اور خون سے آیا یعنی عیسیٰ فقط پانی سے نہیں بلکہ پانی، خون اور روح سے ہے، جو گواہی

دیتی ہے، کیونکہ روح حق ہے۔ تین ہیں جو گواہی دیتے ہیں یعنی روح، پانی اور خون اور یہ تینوں ایک ہیں۔"

۲۔ انجیل یوحنا، باب اول، پہلی آیت سے: "ابتدا میں کلمہ تھا اور کلمہ خدا کے پاس تھا اور کلمہ خدا تھا، وہی ابتدا میں خدا کے پاس تھا۔ تمام چیزیں اسی کے لئے خلق کی گئیں۔ موجودات نے اس کے سوا کسی اور سے وجود نہیں پایا۔ اس میں زندگی تھی اور زندگی انسان کا نور تھی، نور کی درخشش تاریکی میں ہوتی ہے، اور تاریکی اس کو نہ پا سکی۔ خدا کی جانب سے یحییٰ نامی ایک شخص بھیجا گیا، وہ گواہی دینے آیا تاکہ نور پر گواہی دے اور سب اس کے وسیلے سے ایمان لائیں۔ وہ خود نور نہ تھا بلکہ نور پر گواہی دینے آیا تھا۔ وہ حقیقی نور تھا جو ہر انسان کو منور کر دیتا ہے اور اسے دنیا میں آنا تھا، وہ کائنات میں تھا اور کائنات کو اسی کے لئے خلق کیا گیا اور کائنات نے اسے نہ پہچانا، اپنے خواص کے پاس گیا، اس کے خواص نے بھی اسے قبول نہ کیا، لیکن جنہوں نے اسے قبول کیا انہیں قدرت عطا کی کہ خدا کے فرزند بن سکیں۔ یعنی جو کوئی اس کے نام پر ایمان لایا جو نہ تو خون، نہ جسمانی خواہش اور نہ ہی لوگوں کی خواہش سے ہے، بلکہ خدا سے متولد ہوئے ہیں۔ کلمہ جسم میں تبدیل ہوا اور ہمارے درمیان سکونت اختیار کی۔ اسے فیض، سچائی اور جلال سے پُر دیکھا، ایسا جلال جو بے مثال باپ کے بیٹے کے شایان شان تھا۔"

۳۔ انجیل یوحنا، باب ششم، اکیاونویں آیت سے: "میں آسمان سے نازل ہونے والی زندہ روٹی ہوں۔ اگر کوئی اس روٹی سے کھا لے تاابد زندہ رہے گا۔ اور جو روٹی میں عطا کر رہا ہوں وہ میرا جسم ہے، جسے میں کائنات کی زندگی کے لئے عطا کر رہا ہوں، یہود ایک دوسرے سے جھگڑ کر کہا کرتے تھے کہ یہ شخص اپنے جسم کو ہمیں کھانے کے لئے کس طرح دے سکتا ہے۔ عیسیٰ نے ان سے کہا: آمین آمین، میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ اگر تم نے انسان کے بیٹے کا جسم نہ کھایا اور اس کا خون نہ پیا، تو تم لوگ اپنے اندر زندگی نہ پاؤ گے۔ اور جو کوئی میرا جسم کھائے اور میرا خون پیے وہ جاودانہ زندگی پائے گا۔ اور روز قیامت اسے میں اٹھاؤں گا کیونکہ میرا جسم حقیقی کھانا اور میرا خون حقیقی پینے کی شے ہیں۔ بس جو بھی میرا جسم کھائے گا اور میرا خون پیے گا وہ مجھ میں اور میں اس میں رہوں گا۔ جیسا کہ مجھے زندہ باپ نے بھیجا ہے اور میں اس کی وجہ سے زندہ ہوں، اسی طرح جو مجھے کھائے گا وہ بھی میری وجہ سے زندہ رہے گا۔"

۴۔ انجیل یوحنا، باب دوم، تیسری آیت سے: "اور شراب ختم ہوئی تو عیسیٰ کی ماں نے اس سے کہا: ان کے پاس شراب نہیں ہے۔ عیسیٰ نے جواب دیا: اے عورت مجھے تم سے کیا کام ہے، ابھی میرا وقت نہیں ہوا۔ اس کی ماں نے نوکروں سے کہا: تم سے یہ جو کہے انجام دو۔ اس جگہ تطہیر یہود کے حساب سے چھ سنگی ساغر رکھے ہوئے تھے، جن میں

سے ہر ایک میں دو سے تین کیل (۲۷) تک کی گنجائش تھی عیسیٰ نے ان سے کہا: ساغروں کو پانی سے پر کرو۔ انہیں پر کیا گیا تو عیسیٰ نے کہا: اب انہیں اٹھا کر صدر مجلس کے پاس لے جاؤ۔ وہ لے گئے، جب صدر مجلس نے اس پانی کو جو شراب میں تبدیل ہو چکا تھا، چکھا، لیکن اسے معلوم نہ ہوا کہ کہاں سے آیا ہے، البتہ پانی نکالنے والے نوکر جانتے تھے۔ صدر مجلس نے دولھا سے مخاطب ہو کر کہا: ہر ایک پہلے اچھی شراب لاتا ہے اور جب نشہ چھا جائے تو اس سے بدتر، لیکن تم نے ابھی تک اچھی شراب بچا کر رکھی ہوئی ہے۔ اور یہ وہ ابتدائی معجزات ہیں جو عیسیٰ سے قانائے جلیل میں صادر ہوئے۔ اور اپنے جلال کو ظاہر کیا اور اس کے شاگرد اس پر ایمان لائے۔"

اور اب ان آیات کے متعلق بعض نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

الف۔ نصاریٰ کے اصول وعقائد میں جو بات مورد اتفاق ہے وہ تثلیث پر اعتقاد ہے۔ جب کہ انجیل یوحنا کے سترہویں باب کی تیسری آیت یہ کہتی ہے کہ: "جاودانہ زندگی یہ ہے کہ تیری، حقیقی خدائے واحد کے طور پر اور تیرے بھیجے ہوئے عیسیٰ مسیح کی معرفت حاصل کریں۔"

لہٰذا جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے نزدیک تثلیث پر اعتقاد ایک اصل مسلم ہے اور انجیل یوحنا نے خدا کو وحدت حقیقی سے توصیف کیا ہے تو جیسا کہ جز اول یوحنا میں بھی مذکور ہے کہ "تینوں ایک ہیں"، ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ توحید اور تثلیث کو جمع کریں اور کہیں کہ یہ حقیقتاً جدا بھی ہیں اور حقیقتاً متحد بھی۔

کئی دلائل کی بنیاد پر یہ عقیدہ باطل ہے جن میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ اعداد کے مراتب، مثال کے طور پر ایک اور تین، ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ضدین (دو متضاد اشیاء) کا آپس میں اجتماع محال ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں وہ تینوں ایک ہوں اور وہی ایک تین ہوں۔

۲۔ جیسا کہ توحید کی بحث میں بیان ہو چکا ہے، عقیدہ تثلیث کا لازمہ یہ ہے کہ پانچ خداؤں پر اعتقاد ہو اور اسی طرح اس عدد کی تعداد لامتناہی حد تک پہنچ جائے گی، لہٰذا عیسائیوں کے پاس لامتناہی خداؤں پر ایمان لانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

۳۔ تثلیث کا لازمہ ترکیب ہے اور ترکیب کا لازمہ اجزاء اور ان اجزاء کو ترکیب دینے والے کی ضرورت ہے۔

۴۔ عقیدہ تثلیث کا لازمہ، خالق عدد کو مخلوق سے توصیف کرنا ہے، کیونکہ عدد ومعدود، دونوں مخلوق ہیں اور خداوند ہر قسم کی معدودیت سے یہاں تک کہ وحدت عددی سے پاک ومنزہ ہے ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا إِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ

ثَلَاثَةٍ وَّمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا إِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ إِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ﴾(۳۹)اور انہوں نے صراحت کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فرزند خدا کہا، جب کہ قرآن کہتا ہے﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ انْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ أَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ﴾(۴۰)اور یہ جملہ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسے طعام کی محتاج موجود، جو انسانی بدن میں جذب بھی ہوتا ہے اور اس سے خارج بھی ہوتا ہے، عبادت کے لائق نہیں ہوسکتی۔

ب۔ ان باتوں پر عقیدہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کلمہ تھے وکلمہ خدا تھا اور وہ کلمہ جو خدا تھا اس کائنات میں آیا اور جسم میں تبدیل ہوگیا، روٹی بن گیا، اپنے پیروکاروں کے گوشت اور خون کے ساتھ متحد ہوگیا اور اس کا پہلا معجزہ یہ تھا کہ پانی کو شراب میں تبدیل کیا اور جو رسول عقول کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوا ہو اس کا معجزہ نشے میں مدہوش ہونا اور زوال عقل کا باعث ہو، کس عقل ومنطق سے مطابقت رکھتا ہے؟!

ج۔ ایک طرف عیسیٰ کو خدا قرار دیا دوسری طرف سموئیل کی کتاب دوم کے گیارہویں باب میں داؤد پیغمبر - کو شادی شدہ عورت سے زنا کی نسبت دی کہ داؤد نے اس عورت سے زنا کیا جس کے نتیجے میں وہ حاملہ ہوگئی، اس کے بعد اس کے شوہر کو جنگ پر بھیج دیا اور فوج کے سپہ سالار سے کہا کہ اسے جنگ کے دوران لشکر کی اگلی صفوف میں رکھو اور اس کے پیچھے سے ہٹ جاؤ تاکہ مارا جائے اور اس طرح اس کی بیوی اپنے گھر لے آیا، جب کہ انجیل متی کے باب اول میں عیسیٰ کا شجرہ نسب اس شادی تک پہنچاتے ہیں اور صاحب کتاب زبور داؤد پیغمبر پر اس گناہ کی تہمت لگاتے ہیں۔

یہ ہدایت قرآن ہی تھی جس نے خداوند عالم کو ان اوہام سے پاک ومنزہ اور ابن مریم پر اعتقاد کو، انہیں (نعوذ باللہ) زنا زادہ سمجھنے والوں کی تفریط اور خدا کا بیٹا قرار دینے والوں کے افراط سے پاک ومنزہ قرار دیا اور فرمایا﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا﴾(۴۱)یہاں تک کہ فرمایا﴿قَالَ إِنِّي عَبْدُاللّٰهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا﴾(۴۲)اور داؤد کو پاکیزگی کی وہ منزلت عطا کی کہ فرمایا:﴿يَادَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِي الْأَرْضِ﴾(۴۳)اور پیغمبر خاتم ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا﴿اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ ذَا الْأَيْدِ إِنَّهُ أَوَّابٌ﴾(۴۴)

یہ معرفتِ خدا کے سلسلے میں ہدایت قرآن کا ایک نمونہ تھا۔

جب کہ تعلیمات قرآن مجید میں انسان کی سعادت کا نمونہ یہ ہے:

طاقت، دولت، قبیلے اور رنگ جیسے امتیازات کے مقابلے میں انسانی کمالات کو فضیلت کا معیار قرار دیا اور فرمایا﴿یَا أَیُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَأُنْثَیٰ وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاکُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِیمٌ خَبِیرٌ﴾(۴۵)

نشہ آور چیزوں کے استعمال سے فاسد شدہ افکار اور وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے جوئے اور سود خوری کی وجہ سے بیمار اقتصاد کا ان آیات کے ذریعہ اصلاح و معالجہ کیا﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُونَ﴾(۴۶) ﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾(۴۷)، ﴿وَلَا تَأْکُلُوا أَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ﴾(۴۸)

انسانی جانوں کو ان آیات کے ذریعے تحفظ فراہم کیا﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِی حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ﴾(۴۹)، ﴿وَمَنْ أَحْیَاهَا فَکَأَنَّمَا أَحْیَا النَّاسَ جَمِیعًا﴾(۵۰)

کمزوروں پر طاقتوروں کے ظلم وتعدی کے باب کو بند کیا اور لوگوں پر عدل واحسان کے دروازے کھول کر فرمایا﴿فَمَنِ اعْتَدَیٰ عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَیٰ عَلَیْکُمْ﴾(۵۱)، ﴿وَأَحْسِنْ کَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَیْکَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْأَرْضِ﴾(۵۲)، ﴿إِنَّ اللَّهَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾(۵۳)

اور اس دور میں جب عورتوں کے ساتھ حیوانوں جیسا برتاؤ کیا جاتا تھا فرمایا﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾(۵۴)، ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِی عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾(۵۵)

ہر قسم کی خیانت سے روکا اور فرمایا﴿إِنَّ اللَّهَ یَأْمُرُکُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَیٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْکُمُوا بِالْعَدْلِ﴾(۵۶)

عہد وپیمان کے پورا کرنے کو ایمان کی نشانیوں سے قرار دیتے ہوئے فرمایا: ﴿وَالَّذِینَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ﴾(۵۷)، ﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ کَانَ مَسْئُولًا﴾(۵۸)

اور امت کو آیہ﴿یُؤْتِی الْحِکْمَةَ مَنْ یَشَاءُ وَمَنْ یُؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ أُوتِیَ خَیْرًا کَثِیرًا﴾(۵۹) کے ذریعے جہالت ونادانی کی ذلت سے اس طرح نجات دی کہ دنیا میں علم وحکمت کے علمبردار بن کر سامنے آئے۔

اپنے پیروکاروں کو ہر اچھائی کا حکم دیا اور ہر قسم کی برائی سے روکا، طیب و پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال اور خبیث اشیاء کو ان کے لئے حرام قرار دیا اور ان تمام قیود سے جن کا انہوں نے خود کو فطرت کے اصولوں کے برخلاف پابند کر رکھا تھا، نجات دلائی

﴿اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىٕثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾(۶۰)

نیک افعال کے کے دائرے کو عقائد حقہ، اخلاق حمیدہ اور اعمال صالحہ تک وسعت دی، نیز برے اعمال کو باطل عقائد، اخلاق رذیلہ اور فاسد کردار تک بڑھا کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو تمام مومنین و مومنات کی ذمہ داری قرار دیا اور فرمایا: ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَیُطِیْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓىٕكَ سَیَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ﴾(۶۱) اور دوسرے مقام پر فرمایا﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۞ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾(۶۲)ان دو آیات کے ذریعے ہر فرد کے لئے اپنے تمام امور زندگی میں حکمت، عفت، شجاعت اور عدالت تک رسائی اور تمام فضائل انسانیت سے مزین مدینہ فاضلہ کی تشکیل کا راستہ دکھایا۔

اور یہ سب کے سب نمونے آفتاب ہدایت قرآن کی ایک کرن تھے وگرنہ تمام معارف الٰہیہ نیز دنیوی اور اخروی سعادت سے متعلق رہنمائی کے لئے ضروری ہے کہ انسان عقائد، اخلاق، عبادات، معاملات اور سیاست سے متعلق، قرآنی آیات کے اسرار و رموز کا مطالعہ کرے، جس کے لئے مفصل کتب تحریر کرنا ہوں گی۔

۳۔قرآن کی غیب سے متعلق خبریں:

پروردگار عالم کی جانب سے رسالت کے حامل نیز تا قیامت انسانی ہدایت کے دعویدار کے لئے سب سے زیادہ دشوار کام آئندہ کی خبریں دینا ہے، کیونکہ اگر اس کے غلط ہونے کا رتی برابر ایک موہوم سا اندیشہ بھی ہو تو اس محتمل کی عظمت کے باعث جو اس کے آئین کی بنیاد کے منہدم ہونے کا سبب بن سکتی ہے، ضروری ہے کہ احتیاط کا دامن

تھامتے ہوئے اپنے لبوں کو سی لے۔ اب اگر ہم دیکھیں کہ وہ یقین اور نہایت اطمینان خاطر کے ساتھ آئندہ واقع ہونے والے امور سے متعلق اطلاع دے رہا ہے اور وہ خبریں بھی سچ ثابت ہو رہی ہیں، تو اس کی ان خبروں سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ وہ ایسے علم سے متصل ہے جو زمان اور زمانیات(۱) کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

قرآن کی غیب سے متعلق بعض خبریں یہ ہیں:

الف۔ مغلوب ہونے کے بعد دوبارہ روم کے غالب آنے کی خبر دینا ﴿الٓمّٓ ۔ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۔ فِیْ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ﴾(۶۳) اور یہ خبر اس وقت دی گئی جب کوئی شخص ایران کی شکست اور روم کی فتح کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، جس کی کتب تاریخ گواہ ہیں۔

ب۔ آنحضرت ﷺ کے دوبارہ مکہ آنے کی خبر دینا ﴿اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَادُّكَ اِلٰى مَعَادٍ﴾(۶۴)

ج۔ منافقین کی پیغمبر ﷺ کو قتل کرنے کی سازش اور پروردگار عالم کا آپ کی حفاظت کی خبر دینا ﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾(۶۵)

د۔ فتح مکہ، کے موقع پر مسلمانوں کے مسجد الحرام میں داخل ہونے، نیز اس موقع پر ان کے روحی وجسمانی احساسات کی خبر دینا ﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ﴾(۶۶)

ہ۔ غزوہ تبوک سے لوٹنے کے بعد منافقین کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ﴿فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا﴾(۶۷) اور ویسے ہی ہوا جس کی آیت نے پہلے خبر دی تھی۔

و۔ جنگ بدر میں کفار کو اپنی تعداد پر اس قدر غرور تھا کہ وہ اپنی جیت کو یقینی سمجھتے تھے، تو یہ آیت نازل ہوئی ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ۔ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾(۶۸)

---

(۱) زمانیات: ایسی اشیاء جو وقت اور زمان کی قید میں ہوں خواہ وجود میں آ چکی ہو یا نہ آئی ہوں۔

قرآن ایسی کتاب ہے جو معرفت مبدا و معاد، آیات آفاق و انفس، خالق و خلق کے ساتھ انسان کے روابط، فردی واجتماعی ذمہ داریاں، گذشتہ امم کے قصوں اور انبیاء کے حالات جیسے مختلف امور پر مشتمل ہوتے ہوئے ایک ایسے شخص کی زبان پر جاری ہوئی جس نے نہ تو کہیں سے پڑھا اور نہ ہی کوئی اس کا استاد تھا اور جس کے لئے مکہ میں مشرکین کے شر اور مدینہ میں کفار سے جنگوں اور منافقین کے مکر وحیلوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے پریشانی افکار کے تمام اسباب موجود تھے۔

ان پرآشوب حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے طبیعی ہے کہ ایسے شخص کی زبان سے بیان شدہ کتاب کو بہت ہی زیادہ اختلافات پر مشتمل ہونا چاہیے تھا، لیکن قرآن میں عدم اختلاف سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کا نزول فکرِ انسانی کے افق سے کہیں بلند تر ہے، کیونکہ یہ مقام وحی ہے جو جہالت اور غفلت سے منزہ ہے ﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا﴾(۷)

۸۔ قرآن کی علمی اور عملی تربیت:

اگر کسی کا دعوٰی ہو کہ وہ تمام اطباء جہان سے بڑا ہے تو یہ دعوٰی ثابت کرنے کیلئے اس کے پاس دو راستے ہیں:

یا تو علم طب سے متعلق ایسی کتاب پیش کرے کہ اس کی طرح امراض کے اسباب، دواؤں اور علاج کو پہلے کسی نے ذکر نہ کیا ہو۔

یا پھر ایسے مریض کو جس کے تمام اعضاء وجوارح بیماریوں میں مبتلا ہوں، تمام اطباء اس کے علاج سے عاجز آچکے ہوں اور وہ مرنے کے قریب ہو، اگر اس کے سپرد کر دیا جائے تو وہ ایسے مریض کو صحت وسلامتی کا لباس پہنا دے۔

انبیاء علیہم السلام، افکار و روح کے طبیب اور امراض انسانیت کے معالج ہیں۔

ان میں سرفہرست پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات اطہر ہے، جس کی علمی دلیل قرآن جیسی کتاب ہے جو انسان کے فکری، اخلاقی اور عملی امراض کے اسباب وعلاج میں بے مثال ہے اور ہدایت قرآن کی بحث میں مختصر طور پر جس کے چند نمونے ذکر کیے گیے ہیں اور عملی دلیل یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ بدترین امراضِ انسانیت میں مبتلا ایک معاشرے میں مبعوث ہوئے جن کے افراد فکری اعتبار سے اس حد تک گر چکے تھے کہ ہر قبیلے کے پاس اپنا ایک مخصوص بت تھا،

بلکہ گھروں میں افراد اپنے لئے کھجور اور حلوے سے معبود بناتے تھے، صبح سویرے ان کے سامنے سجدہ بجالاتے اور بھوک کے وقت انہیں معبودوں کو کھالیا کرتے تھے۔

معرفت اور ایمان کے مرہم کے ذریعے ناسور زدہ افکار کا ایسا علاج کیا کہ وہ لوگ خالق جہاں کی تعریف ان الفاظ میں کرنے لگے ﴿اَللّٰهُ لاَ اِلٰهَ اِلاَّ هُوَالْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لاَ تَاْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلاَ نَوْمٌ لَّهُ مَافِي السَّمٰوَاتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ اِلاَّ بِاِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لاَ يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ اِلاَّ بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ وَلاَ يَؤُدُهُ حِفْظُهُمَا وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ﴾(۸۰)اور اس خالق حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہوکر کہنے لگے ((سبحان ربی الاعلی وبحمدہ))

باہمی الفت کے اعتبار سے حیوانات سے زیادہ پست تھے کہ باپ اپنے ہی ہاتھوں اپنی بیٹی کو نہایت ہی سنگدلی سے زندہ دفن کردیتا تھا۔(۸۱) اس درندہ صفت قوم میں باہمی الفت کو اس طرح زندہ کیا کہ مصر کی فتح کے بعد جب مسلمانوں نے دیکھا کہ ایک خیمے میں پرندے نے گھونسلا بنایا ہوا ہے تو واپس پلٹتے وقت اس خیمے کو وہیں پر رہنے دیا کہ کہیں پرندے کے بچے اور گھونسلا ویران نہ ہوجائیں اور اسی لئے وہاں آباد ہونے والے شہر کا نام "فسطاط" رکھا گیا۔(۸۲)

فقراء کے مقابلے میں اغنیاء کے اظہار قدرت وگستاخی کو اس طرح دور کیا کہ ایک دن جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک مالدار شخص بیٹھا تھا، ایسے میں ایک نادار شخص آکر اس کے ساتھ بیٹھ گیا، اس مالدار شخص نے اپنا دامن ہٹالیا اور جب متوجہ ہوا کہ آنحضرت ﷺ یہ سب دیکھ رہے ہیں، کہنے لگا: یارسول اللہ ﷺ! میں نے اپنی آدھی ثروت اس غریب کو دی، اس غریب نے کہا: مجھے قبول نہیں ہے، کہیں میں بھی اس مرض میں مبتلا نہ ہوجاؤں جس میں یہ مبتلا ہے۔(۸۳)

یہ کیسی تربیت تھی کہ مالدار کو ایسی بخشش اور نادار کو اتنی بلند نظری عطا کی اور امیر کے تکبر کو تواضع اور غریب کی ذلت کو عزت میں تبدیل کردیا۔

کمزور پر طاقتور کے مظالم کا اس طرح قلع قمع کیا کہ امیرالمومنین -کی حکومت کے زمانے میں جس وقت مسلمانوں کے خلیفہ کے پاس ایران اور روم کے شہنشاہوں جیسی عظیم فوجی طاقتیں موجود تھیں اور مالک اشتر سپہ سالار تھے، ایک دن جب مالک اشتر ایک سادہ اور عام انسان کی طرح بازار سے گزر رہے تھے تو کسی نے ان کا مذاق

وہ، کہ جس کی ہیبت سے دن کے وقت میدان جنگ میں بڑے بڑے بہادروں کے بدن کانپ اٹھتے تھے، راتوں کو محراب عبادت میں مار گزیدہ انسان کی مانند، تڑپتے ہوئے اشکبار آنکھوں کے ساتھ اس طرح فریاد کرتا تھا: ''اے دنیا! اے دنیا! کیا تو میرے پاس آئی ہے؟! کیا تو میری مشتاق ہے؟! ہیہات! ہیہات! کسی اور کو دھوکہ دے، مجھے تیری کوئی حاجت نہیں، میں نے تجھے تین طلاقیں دیں......آہ! آہ! زادراہ کتنا کم ہے اور راہ کتنی طویل ہے؟'' (۹۶)

سائل کے سوال کرنے پر حکم دیا: اسے ایک ہزار دے دو۔ جسے حکم دیا تھا اس نے پوچھا: سونے کے ہزار سکے دوں یا چاندی کے؟ فرمایا: میرے نزدیک دونوں پتھر ہیں، جس سے سائل کو زیادہ فائدہ پہنچے وہ دے دو۔(۹۷)

شجاعت اور سخاوت کا ایسا امتزاج کس امت وملت میں پایا جاتا ہے کہ میدان جنگ میں لڑائی کے دوران جب ایک مشرک نے کہا: یا ابن ابی طالب! ھبنی سیفک، تو آپ - نے تلوار اس کی جانب پھینک دی۔ جب مشرک نے کہا: واعجبا! اے فرزند ابی طالب! ایسے سخت وقت میں تم نے اپنی تلوار مجھے دے دی؟ تو آپ - نے فرمایا: تم نے میری طرف دست سوال دراز کیا تھا اور سائل کو رد کرنا کرم کے خلاف ہے۔ اس مشرک نے اپنے آپ کو زمین پر گرا کر کہا: یہ اہل دین کی سیرت ہے!!، پھر آپ کے قدموں کا بوسہ لیا اور مسلمان ہوگیا۔(۹۸)

ابن زبیر نے آپ - کے پاس آکر کہا: میں نے اپنے والد کے حساب کتاب میں دیکھا ہے کہ آپ - کے والد میرے والد کے اسی ہزار درہم کے مقروض تھے۔ آپ - نے وہ رقم اسے دے دی۔ اس کے بعد دوبارہ پلٹ کر واپس آیا اور کہنے لگا مجھ سے غلطی ہوئی ہے، آپ کے والد نہیں بلکہ میرے والد آپ کے والد کے مقروض تھے۔ آپ - نے فرمایا وہ رقم تمہارے والد کے لئے حلال اور جو رقم تم نے مجھ سے لی وہ بھی تمہاری ہوئی۔(۹۹)

زمانہ ایسے صاحب منصب کی مثال کہاں پیش کرسکتا ہے جس کی حکومت مصر سے خراسان تک پھیلی ہوئی ہو اور عورت کے کاندھے پر پانی کی مشک دیکھ کر اس سے لے اور منزل تک پہنچا آئے۔ اس سے احوال پرسی کرنے کے بعد، صبح تک اضطراب کی وجہ سے سو نہ سکے کہ اس بیوہ عورت اور اس کے بچوں کا خیال کیوں نہ رکھا گیا۔ اگلے دن صبح سویرے یتیموں کے لئے اشیاء خوردنی لے جائے، کھانا پکا کر اپنے ہاتھوں سے بچوں کو کھلائے اور عورت امیر المومنین - کو پہچاننے کے بعد جب شرمندگی کا اظہار کرے تو اس کے جواب میں کہے: اے کنیز خدا! تم سے شرمندہ تو میں ہوں۔(۱۰۰)

اپنی خلافت کے زمانے میں اپنے نوکر کے ساتھ کپڑے کے بازار سے گزرتے ہوئے لٹھے کی دو قمیصیں خریدے

اور ان میں سے اچھی قمیض اپنے نوکر کو عطا کر دے تا کہ نوجوان کی خواہشِ آرائش کی تسکین ہوتی رہے اور کم قیمت لباس خود پہنے۔(۱۰۱)

زر و جواہر کے خزانے اختیار میں ہونے کے باوجود فرمایا: ((واللّٰہ لقد رقعت مدرعتي ھذہ حتی استحییت من راقعھا))(۱۰۲)

آپ - کی خدمت میں مالِ غنیمت لایا گیا جس پر ایک روٹی بھی رکھی تھی۔ کوفہ کے سات محلّے تھے۔ اس غنیمت اور روٹی کے سات حصے کیے، ہر محلے کے منتظم کو بلا کر اسے غنیمت اور روٹی کا ایک حصہ دیا(۱۰۳)۔ غنیمت کو تقسیم کرنے کے بعد ہمیشہ دو رکعت نماز بجالاتے اور فرماتے: ((الحمد للّٰہ الذي اخرجني منه کما دخلته))(۱۰۴)

ایامِ حکومت میں اپنی تلوار بیچنے کی غرض سے بازار میں رکھوائی اور فرمایا: اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں علی کی جان ہے! اگر ایک لنگ خریدنے کے بھی پیسے میرے پاس ہوتے تو اپنی تلوار ہرگز نہ بیچتا۔(۱۰۵)

جب کبھی آپ - پر کوئی مصیبت وارد ہوتی اس دن ہزار رکعت نماز بجالاتے، ساٹھ مسکینوں کو صدقہ دیتے اور تین دن روزہ رکھتے تھے۔(۱۰۶)

خون پسینے کی کمائی سے ہزار غلام آزاد کیے(۱۰۷)، اور دنیا سے رخصت ہوئے تو آٹھ لاکھ درہم کے مقروض تھے۔(۱۰۸)

جس رات افطار کے لئے اپنی بیٹی کے ہاں مہمان تھے، اس وسیع ملک کے فرمانروا کی بیٹی کے دسترخوان پر جَو کی روٹی، نمک اور دودھ کے ایک پیالے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ آپ - نے جَو کی روٹی اور نمک سے افطار فرمایا اور دودھ چھوا تک نہیں کہ کہیں آپ - کا دسترخوان رعایا کے دسترخوان سے زیادہ رنگین نہ ہوجائے۔(۱۰۹)

تاریخ کو اس جیسی کوئی دوسری شخصیت دیکھنا نصیب ہی نہ ہوئی کہ مصر سے خراسان تک سلطنت ہونے کے باوجود خود اس کے اور اس کے گورنروں کے لئے حکومت کا منشور ایسا ہو جسے امیر المؤمنین - نے عثمان بن حنیف کے خط میں منعکس کیا ہے۔ اس خط کا مضمون و مفہوم تقریباً یہ ہے:

''اے ابن حنیف! مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بصرہ کے بڑے لوگوں میں سے ایک شخص نے تمہیں کھانے پر بلایا اور تم لپک کر پہنچ گئے۔ رنگا رنگ کھانے اور بڑے بڑے پیالے تمہارے لئے لائے گئے۔ امید نہ تھی کہ تم ان لوگوں کی دعوت قبول کر لو گے کہ جن کے فقیر و نادار دھتکار دیے گئے ہوں اور جن کے دولت مند مدعو ہوں۔ جو لقمے چباتے ہو، انہیں دیکھ لیا کرو اور جس کے متعلق شبہ ہو اسے چھوڑ دو اور جس کے پاک و پاکیزہ راہ سے حاصل ہونے کا یقین ہو

اس میں سے کھاؤ۔

جان لو کہ ہر مقتدی کا ایک پیشوا ہوتا ہے جس کی وہ پیروی کرتا ہے اور جس کے نور علم سے کسب نور کرتا ہے۔ دیکھو تمہارے امام کی حالت تو یہ ہے کہ اس نے دنیا کے ساز وسامان میں سے دو بوسیدہ چادروں اور دو روٹیوں پر قناعت کرلی ہے۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے لیکن اتنا تو کرو کہ پرہیزگاری، سعی وکوشش، پاکدامنی اور امور میں مضبوطی سے میرا ساتھ دو، خدا کی قسم میں نے تمہاری دنیا سے سونا سمیٹ کرنہیں رکھا، نہ اس کے مال ومتاع میں سے انبار جمع کر رکھے ہیں، نہ اپنے اس بوسیدہ لباس کی جگہ کوئی اور بوسیدہ لباس تیار کیا ہے اور نہ ہی اس دنیا کی زمین سے ایک بالشت پر بھی قبضہ جمایا ہے۔"

یہاں تک کہ فرماتے ہیں: "اگر میں چاہتا تو صاف ستھرے شہد، عمدہ گیہوں اور ریشم کے بنے ہوئے کپڑوں کو اپنے لئے مہیا کرسکتا تھا، لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خواہشات مجھ پر غلبہ حاصل کرلیں اور حرص مجھے اچھے اچھے کھانے چن لینے کی دعوت دے، جب کہ حجاز اور یمامہ میں شاید ایسے لوگ ہوں کہ جنہیں ایک روٹی ملنے کی آس بھی نہ ہو اور نہ ہی کبھی انہیں پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوا ہو۔"(۱۱۰)

اسلامی حکومت کی حقیقت کو ایسے شخص کے آئینے میں دیکھنا چاہئے جو خود کوفہ میں ہوتے ہوئے لذیذ کھانے کی طرف اس احتمال کی بنا پر ہاتھ تک نہیں بڑھاتا کہ کہیں حجاز یا یمامہ میں کوئی بھوکے پیٹ نہ ہو، جو لٹھے کے ایک پرانے پیوند لگے کرتے کے ہوتے ہوئے دوسرے پرانے کرتے کے بارے میں سوچتا بھی نہیں اور اپنے لئے ایک بالشت زمین تک تیار نہیں کرتا۔ اس دنیا سے اس کی روٹی، کپڑے اور مکان کی حد یہیں تک ہے کہ کہیں اس کا معیار زندگی اس کی رعایا کے فقیر ترین فرد سے بہتر نہ ہو جائے۔

اس کی سلطنت میں عدالت اس طرح حکم فرما تھی کہ ایک دن اپنی زرہ یہودی کے پاس دیکھی تو اس سے کہا: "یہ زرہ میری ہے"۔ اسلام کی پناہ میں زندگی بسر کرنے والے یہودی نے کمال جرأت کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہا:

"یہ زرہ میری ہے اور میرے ہاتھ میں ہے، میرے اور تمہارے درمیان مسلمانوں کا قاضی فیصلہ کرے گا"۔

یہ جاننے کے باوجود کہ یہودی نے خیانت کی ہے اور زرہ چرائی ہے اس کے ساتھ قاضی کے پاس گئے اور جب قاضی، حضرت - کے احترام میں کھڑا ہوا تو قاضی کے اس امتیاز برتنے پر اس سے ناراضگی کا اظہار کیا اور فرمایا: اگر یہ مسلمان ہوتا تو ضرور اس کے ساتھ ہی تمہارے سامنے بیٹھتا۔

آخر کار اس عدلِ مطلق کو دیکھ کر یہودی نے اعتراف کر لیا اور اسلام لے آیا۔آپ - زرہ کے ساتھ اپنا مرکب بھی اس یہودی کو بخش دیتے ہیں ۔یہودی مسلمان ہونے کے بعد آپ - سے جدا نہ ہوا یہاں تک کہ جنگ صفین میں شہادت کے مقام پر فائز ہوا۔(۱۱۱)

جب آپ - کو خبر ملی کہ اسلام کی پناہ میں زندگی گزارنے والی غیر مسلم عورت کے پاؤں سے پازیب چھین لی گئی ہے تو اس قانون شکنی کا تحمل نہ کر پائے اور فرمایا:((فلو ان امرأ مسلما مات من بعد ھذا اسفا ماکان به ملوما،بل کان به عندی جدیرا))(۱۱۲)

راستے میں ایک بوڑھے کو دستِ سوال دراز کرتے ہوئے دیکھ کر جستجو شروع کی کہ اس کے بھیک مانگنے کا سبب کیا ہے۔آپ -کو تسلی دیتے ہوئے کہا گیا یہ بوڑھا نصرانی ہے۔آپ - نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: جوانی میں اس سے کام لیتے رہے اور بڑھاپے میں بھیک مانگنے کے لئے چھوڑ دیا ہے؟!اور حکم دیا کہ اس کے مخارج زندگی بیت المال سے دیئے جائیں ۔(۱۱۳)

خلق کو حقوق مہیا کرنے کا یہ حال تھا کہ چیونٹی کے منہ سے اس کی محنت سے حاصل کیا ہوا جو کا چھلکا چھیننے کے بدلے میں ہفت اقلیم معہ ان اشیاء کے جو ان کے آسمانوں کے نیچے ہیں لینے کو تیار نہ تھے ۔(۱۱۴)اور خالق کے حقوق نبھانے میں یہ کیفیت تھی کہ نہ جنت کے شوق،نہ جہنم کے خوف ، بلکہ اسی کو اہل عبادت جان کر اس کی عبادت میں ہمہ تن معروف تھے ۔(۱۱۵)

جیسا کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا:((انا ادیب اللّٰہ و علی ادیبی))(۱۱۶)،ایسے انسان کی تربیت کر کے بشریت کو مقامِ کمال پر پہنچا دیا،کہ جس نے میدان جنگ کی ایسی پامردی واستقامت ، کہ جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی اور ایسی رقت قلبی کا امتزاج پیش کیا کہ اگر یتیم کے چہرے پر نظر پڑ جاتی تو رخسار پر آنسو جاری ہو جاتے اور جگر سوز فریاد بلند ہوتی اور اس تربیت نے اسے آزادی وحریت کی اس منزل تک پہنچا دیا کہ پھر وہ دنیا کے محدود اور آخرت کے نامحدود تمام مصالح ومنافع سے بلند وبالا ہو کر صرف بندگی وعبادت پروردگار عالم کے طوق غلامی کو،وہ بھی اپنے فائدے کے لئے نہیں بلکہ اس کی اہلیت کی وجہ سے اپنی گردن میں ڈال لیا۔اور آزادی کے ساتھ ایسی بندگی کا امتزاج پیش کیا جو خلقت جہان وانسان کا اصل مقصد ہے اور اپنی رضا وغضب کو خالق کی رضا وغضب میں اس طرح فنا کیا کہ جس پر لیلۃ المبیت(۱۱۷) میں رسول اللہ ﷺ کے بستر پر نیند اور خندق کے دن ثقلین کی عبادت

سے افضل ضربت، (۱۱۸) گواہ ہیں۔

یقیناً، ایسا باغبان جو سیم زدہ جزیرۃ العرب میں چند محدود سالوں کے عرصے میں سخت ترین مشکلات میں مبتلا ہونے کے باوجود، دنیا کے سامنے ایک ایسی امت اور درخت آدمیت کا ایسا بہترین پھل پیش کرے، یہ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ بوستان انسانیت کا سب سے بڑا باغبان میں ہوں۔

آیا عقل وانصاف یہ تقاضا نہیں کرتے کہ ان معجزات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ جنہیں اس مختصر مقدمے میں ذکر کرنا ممکن نہیں، صرف اس ایک علمی وعملی نمونے کی بنیاد پر کہ جس کا نہایت ہی مختصر الفاظ میں ذکر کیا گیا، انسان تعصب اور ہوا وہوس کو خود سے دور کرتے ہوئے اس بات پر ایمان لے آئے کہ فقط آئین اسلام ہی بشریت کو کمال کے آخری درجے تک پہنچا سکتا ہے؟! اور آیا فطرت وعقل انسانی جس چیز کا دین سے علماً وعملاً تقاضا کرتی ہے، کیا اس دین میں کما حقہ موجود نہیں؟!

آیا انسان سازی کے لئے انفرادی واجتماعی نقطہ نظر سے اس سے بڑھ کر کوئی اور تعلیم وتربیت بھی ہے؟! یہی چیز پیغمبر اسلام ﷺ کی خاتمیت اور ان کی شریعت کے ابدی ہونے پر ایمان ہے ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَٰكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا﴾ (۱۱۹)

آخر میں آنحضرت ﷺ کے خورشید زندگی کی ایک شعاع پر، جو ان کی رسالت کی گواہ بھی ہے، نظر ڈالتے ہیں:

جس دور میں دعوت اسلام کے اظہار پر مال ومقام کی پیشکش اور دھمکیاں اپنی آخری حد کو پہنچ گئیں، قریش نے ابوطالب ؑ کے پاس آکر کہا: تمہارے بھتیجے نے ہمارے خداؤں کو برا کہا، ہمارے جوانوں کو تباہ اور جماعت کو منتشر کردیا۔ اگر اسے مال چاہیے تو ہم اتنا مال ودولت جمع کریں گے کہ تمام قریش میں بے نیاز ترین شخص بن جائے اور جس عورت سے چاہے اس سے شادی کردیں گے، یہاں تک کہ سلطنت وبادشاہی کا وعدہ بھی دیا گیا، لیکن آنحضرتؐ کا جواب یہ تھا: اگر میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند لاکر رکھ دیں پھر بھی میں اس دعوت سے باز نہیں آؤں گا۔ (۱۲۰)

یہ دیکھ کر کہ اس لالچ دلانے کا بھی اثر نہ ہوا تو انہوں نے دھمکیوں اور اذیتوں کا سہارا لیا، جن کا ایک نمونہ یہ ہے کہ جب آپ ﷺ مسجد الحرام میں نماز شروع کرتے بائیں جانب سے دو شخص سیٹی اور دائیں طرف سے دو شخص تالیاں بجاتے، تاکہ نماز میں خلل ڈالیں۔ (۱۲۱) راستہ چلتے وقت آپ ﷺ کے سر مبارک پر خاک پھینکا کرتے اور

سجدے کی حالت میں آپ ﷺ پر بھیڑ کی اوجھڑی پھینکتے۔(۱۲۲)

حضرت ابوطالب۔کی رحلت کے بعد آپ نے قبیلۂ ثقیف کے بزرگوں سے تبلیغ دین کے سلسلے میں مدد لینے کے لئے طائف کی جانب سفر کیا، لیکن انہوں نے دیوانوں اور غلاموں کو اس بات پر اکسایا کہ آنحضرت ﷺ کا پیچھا کر کے آپ کو آزار پہنچائیں۔ آنحضرت ﷺ نے ایک باغ میں پناہ لی اور انگور کی بیل کے سائے میں بیٹھ گئے۔ آنحضرت ﷺ کی حالت اتنی رقت بار تھی کہ مشرک دشمن کو بھی آپ ﷺ کی حالت پر رحم آگیا اور عداس نامی نصرانی غلام سے کہا: انگور توڑ کر اس کے پاس لے جاؤ۔ جب غلام نے انگوروں کا طبق آپ ﷺ کے پاس لا کر رکھا، آپ ﷺ نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا: بسم اللہ۔

غلام نے کہا: اس شہر کے لوگ تو یہ کلمات نہیں بولتے۔

فرمایا: کس شہر سے ہو؟ اور تمہارا دین کیا ہے؟ اس نے کہا: نصرانی ہوں اور میرا تعلق نینوا سے ہے۔

فرمایا: یونس بن متی کے شہر سے؟

عداس نے کہا: یونس کو کہاں سے جانتے ہو؟

فرمایا: وہ میرا بھائی اور پیغمبر تھا، میں بھی پیغمبر ہوں۔ یہ سنتے ہی عداس نے آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پاؤں کا بوسہ لیا۔(۱۲۳)

آنحضرت ﷺ کے پیروکاروں کو سخت ترین تشدد کے ذریعے تکالیف میں مبتلا کیا جاتا اور ان میں سے بعض کو جلتی دھوپ میں ڈال کر ان کے سینوں پر بھاری بھرکم پتھر رکھے جاتے لیکن اس کے باوجود ان کی زبان پر یہ کلمات جاری ہوتے: ''احد، احد۔''(۱۲۴)

عمار یاسر کی ضعیف العمر اور ناتواں ماں سمیہ کو نہایت شدید اذیتوں میں رکھا گیا تا کہ دین خدا کو چھوڑ دے، آخر کار جب وہ بوڑھی خاتون نہ مانی تو اسے دردناک طریقے سے قتل کر دیا گیا۔(۱۲۵)

اس قوم سے اتنی زیادہ تکالیف کا سامنا کرنے کے بعد جب آپ ﷺ سے ان کے خلاف بد دعا کرنے کو کہا گیا تو فرمایا: ((إنما بعثت رحمة للعالمين))(۱۲۶) اور ان مظالم کے مقابلے میں اس قوم پر عنایت و مہربانی کا یہ عالم تھا کہ یہ دعا فرماتے: ''اے پروردگار! میری قوم کو ہدایت فرما کہ یہ نادان ہیں۔''(۱۲۷)

عذاب مانگنے کے بجائے رحمت کی دعا کیا کرتے۔ رحمت بھی وہ کہ جس سے بڑی رحمت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

یعنی نعمتِ ہدایت۔ ''قومی'' (میری قوم) کا لفظ استعمال کر کے اس قوم کو خود سے منسوب کر دیا کہ اس نسبت سے ان کو عذاب خدا سے بچاؤ کا تحفہ عطا کر دے، خدا کی بارگاہ میں ان کی شکایت کرنے کے بجائے شفاعت کرتے اور ان کی جانب سے یہ عذر پیش کرتے کہ یہ نادان ہیں۔

زندگی گزارنے کا انداز یہ تھا کہ جو کی روٹی خوراک تھی، اس کو بھی کبھی سیر ہو کر تناول نہ کیا۔(۱۲۸)

غزوۂ خندق میں آپ ﷺ کی بیٹی صدیقۂ کبریٰ علیہا السلام، آپ ﷺ کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا لائی جو تین دن کے فاقے کے بعد پہلی غذا تھی، جسے آپ ﷺ نے تناول فرمایا۔(۱۲۹)

اور زندگی کا یہ انداز تنگدستی کی وجہ سے نہ تھا، اس لئے کہ اسی زمانے میں آپ ﷺ کی بخشش وعطا سو اونٹوں تک بھی پہنچتی تھی۔(۱۳۰)

دنیا سے جاتے وقت نہ آپ ﷺ نے درہم و دینار چھوڑے، نہ غلام و کنیز اور نہ ہی کوئی بھیڑ اور اونٹ، بلکہ آپ کی زرہ بھی مدینہ کے ایک یہودی کے پاس تھی، جسے آپ ﷺ نے گھر والوں کی غذا کے انتظام کے لئے خریدے گئے بیس صاع جو کے بدلے گروی رکھوایا تھا۔(۱۳۱)

دو نکات کی طرف توجہ ضروری ہے:

۱۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے مقام ومنزلت اور بے نظیر امانت داری کے ہوتے ہوئے کوئی بھی آپ سے گروی رکھنے کا تقاضا نہیں کرتا تھا، لیکن یہ سمجھانا مقصود تھا کہ قرض کی تحریری دستاویز نہ ہونے کی صورت میں، اسلام کی عظیم ترین شخصیت تک، ایک یہودی کے حق میں بھی قانونِ رہن کا خیال رکھے، جو صاحب مال کے لیے وثیقہ ہے۔

۲۔ لذیز ترین غذائیں فراہم ہونے کے باوجود پوری زندگی جو کی روٹی سے اس لئے سیر نہ ہوئے کہ کہیں آنحضرتؐ کی غذا رعایا کے نادار ترین فرد کی غذا سے بہتر نہ ہو۔

آپ ﷺ کے ایثار کا نمونہ یہ ہے کہ وہ بیٹی جس کے فضائل سنی اور شیعہ کتب میں بکثرت ذکر کئے گئے ہیں، قرآن مجید میں مباہلہ(۱۳۲) اور تطہیر(۱۳۳) جیسی آیات اور حدیث کساء(۱۳۴) وعنوان ((سیدة نساء أهل الجنة))(۱۳۵) جیسے بلند مرتبہ مضمون پر مشتمل احادیث جو اس انسان کامل میں ممکنہ کمال انسانی کے مکمل تحقق کی دلیل ہیں، ایسی بیٹی جس کے توسط سے رسول خدا ﷺ کی نسل تا قیامت باقی رہے گی، وہ جس کی آغوش میں مطلعِ نجومِ ہدایت اور ائمہ اطہار پروان چڑھتے رہے اور پیغمبر اسلام ﷺ کے نزدیک جس کے احترام کا عالم یہ تھا کہ جب بھی

آنحضرت ﷺ کی خدمت میں تشریف لاتیں آنحضرت ﷺ اپنی جگہ پر بٹھاتے اور ہاتھوں کا بوسہ لیا کرتے تھے۔(۱۳۶)وہ بیٹی جو والد گرامی کی اقتداء میں محراب عبادت میں اتنا قیام کرتیں کہ دونوں پاؤں پر ورم آجاتا(۱۳۷)اور اتنا زیادہ محو عبادت ہونے کے باوجود امیر المومنین -کے گھر اس طرح خانہ داری کرتیں کہ ایک دن جب پیغمبر اسلام ﷺ تشریف لائے تو آپ بچے کو دودھ پلانے کے ساتھ ساتھ چکی بھی چلا رہی تھیں، آنحضرت ﷺ نے آنسوؤں سے تر آنکھوں کے ساتھ یہ رقت بار منظر دیکھا اور فرمایا:((تعجلی [تجرئی]مرارة الدنیا بحلاوة الآخرة))(۱۳۸)تو آنحضرت ﷺ کے جواب میں کہا:((یا رسول اللّٰہ(ﷺ)! الحمد للّٰہ علی نعمائه والشکر للّٰہ علی آلائه))۔ایسی بیٹی اپنے چکی چلانے کی وجہ سے گٹے پڑے ہوئے ہاتھوں کو لے کر والد گرامی کے پاس کنیز مانگنے کے لئے تو آئی لیکن اپنی حاجت بیان کئے بغیر لوٹ گئی اور وہ باپ جو اگر چاہتا تو بیٹی کے گھر میں زر و جواہر کا انبار لگا سکتا تھا، خدمت گزاری کے لئے غلام اور کنیزیں دے سکتا تھا، اس نے خدمت گزار کے بجائے چونتیس مرتبہ تکبیر، تینتیس مرتبہ تحمید اور تینتیس مرتبہ تسبیح تعلیم فرمائی۔(۱۳۹)

یہ ہے کردار حضرت ختمی مرتبت ﷺ، کہ اتنے سخت حالات میں زندگی بسر کرنے والی ایسی بیٹی کے مقابلے میں ناداروں کے ساتھ کس طرح ایثار فرماتے ہیں اور وہ ہے والد گرامی کی صبر کی تلقین کے جواب میں مادی و معنوی نعمتوں کا شکر بجالانے والی صدیقہ کبریٰ، جو رضا بقضائے الہی میں فنا اور الطاف الہیہ میں استغراق کا ایسا نمونہ پیش کرتی ہے کہ کڑواہٹ کو مٹھاس اور مصیبت و پریشانی کو اس کی نعمت قرار دیتے ہوئے اس پر صبر کی بجائے حمد و شکر کو اپنی ذمہ داری سمجھتی ہے۔

آپ ﷺ کے اخلاق و کردار کا نمونہ یہ ہے کہ خاک پر بیٹھتے،(۱۴۰)غلاموں کے ساتھ کھانا کھاتے اور بچوں کو سلام کرتے تھے۔(۱۴۱)

ایک صحرا نشین عورت آپ ﷺ کے پاس سے گزری تو دیکھا آپ ﷺ خاک پر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔اس عورت نے کہا:اے محمد ﷺ! تمہاری غذا غلاموں جیسی ہے اور بیٹھنے کا انداز بھی غلاموں جیسا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا:مجھ سے بڑھ کر غلام کون ہوگا۔(۱۴۲)

اپنے لباس کو اپنے ہاتھوں سے پیوند لگاتے(۱۴۳)، بھیڑ کا دودھ نکالتے(۱۴۴)اور غلام و آزاد دونوں کی دعوت قبول کرتے تھے۔(۱۴۵)

اگر مدینہ کے آخری کونے میں بھی کوئی مریض ہوتا اس کی عیادت کو جاتے۔(۱۴۶)

فقراء کے ساتھ ہم نشینی فرماتے اور مساکین کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ جاتے۔(۱۴۷)

آپ ﷺ غلاموں کی طرح کھاتے اور غلاموں کی مانند بیٹھتے تھے۔(۱۴۸)

جو کوئی آپ ﷺ سے ہاتھ ملاتا، جب تک وہ خود نہ چھوڑتا آپ اپنا ہاتھ نہیں کھینچتے تھے۔(۱۴۹)

جب کسی مجلس میں تشریف لاتے تو آنے والے جہاں تک بیٹھ چکے ہوتے ان کے بعد بیٹھ جاتے(۱۵۰) اور کسی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر نہیں دیکھتے۔(۱۵۱)

پوری زندگی میں سوائے خدا کی خاطر کسی پر غضب نہ کیا۔(۱۵۲)

ایک عورت آنحضرت ﷺ کے ساتھ گفتگو کر رہی تھی، بات کرتے وقت اس کے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی تو آپ نے فرمایا: آرام واطمینان سے بات کرو، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، میں اس عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتا تھی۔(۱۵۳)

انس ابن مالک نے کہا: میں نو سال آنحضرت ﷺ کی خدمت میں تھا آپ ﷺ نے کبھی نہ کہا: ''ایسا کام کیوں کیا؟'' اور کبھی عیب جوئی نہ فرمائی۔(۱۵۴)

ایک دن مسجد میں تشریف فرما تھے، انصار کے بچوں میں سے ایک بچی نے آکر آپ ﷺ کے لباس کا ایک کونا پکڑا۔ آپ ﷺ اس کی حاجت روائی کے لئے اٹھے، لیکن نہ تو اس بچی نے کچھ کہا اور نہ آپ ﷺ نے پوچھا کہ تمھیں کیا چاہیے؟ یہاں تک کہ یہ عمل چار مرتبہ تکرار ہوا۔ چوتھی مرتبہ اس نے حضرت ﷺ کے لباس سے دھاگہ توڑ لیا اور چلی گئی۔ اس بچی سے پوچھا گیا: یہ تم نے کیا کام کیا؟

اس بچی نے کہا: ہمارے یہاں ایک شخص مریض ہے۔ مجھے بھیجا گیا کہ میں اس کی شفا کے لئے آنحضرت ﷺ کے لباس سے دھاگہ توڑ کر آؤں۔ جب بھی میں دھاگہ لینا چاہتی تھی میں دیکھتی تھی کہ آنحضرت ﷺ مجھے دیکھ رہے ہیں اور اجازت لینے میں مجھے شرم آتی تھی، یہاں تک کہ چوتھی بار دھاگہ نکالنے میں کامیاب ہوگئی۔(۱۵۵)

احترامِ انسان کے سلسلے میں، یہ واقعہ آنحضرت ﷺ کی خاص توجہ کی نشاندہی کرتا ہے، کیونکہ اپنی فراست سے بچی کی حاجت اور سوال سے کراہت کو سمجھ کر اس کی حاجت روائی کے لئے چار مرتبہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن یہ نہ پوچھا کہ اسے کیا چاہئے، تاکہ اس کیلئے ذہنی پریشانی وذلتِ سوال کا باعث نہ ہو۔

اس باریکی اور دقت نظری سے بچی کی حرمت وعزت کا پاس رکھنے والے کی نظر مبارک میں بڑوں کے مقام ومنزلت کی کیا حد ہوگی۔

جن دنوں یہودی، کافر ذمی کے عنوان سے اسلام کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہے تھے اور آنحضرت ﷺ کا اقتدار اپنے عروج پر تھا۔ ایک یہودی کے چند دینار آپ ﷺ پر قرض تھے۔ جب اس یہودی نے واپسی کا مطالبہ کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس وقت میرے پاس تمہیں دینے کو کچھ نہیں ہے۔''

یہودی نے کہا: ''میں اپنے دینار لئے بغیر آپ ﷺ کو بالکل نہیں چھوڑوں گا۔''

فرمایا: ''اچھا میں تمہارے پاس بیٹھا ہوں۔'' ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور صبح کی نماز وہیں ادا کی۔ صحابہ نے اس یہودی کو دھمکی دی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے ہو؟''

اصحاب نے کہا: ''یارسول اللہ ﷺ! اس یہودی کی یہ جرأت کہ آپ ﷺ کو محبوس کرے؟''

فرمایا: ''پروردگار عالم نے مجھے اس لئے مبعوث نہیں کیا کہ ظلم کروں''۔ جیسے ہی دن چڑھا اس یہودی نے کہا: ''**اشهد ان لا اله الله واشهد ان محمداًعبده ورسوله**، میں اپنے مال کا ایک حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہوں، خدا کی قسم! میں نے آپ ﷺ کے ساتھ ایسا سلوک صرف اس لئے کیا تا کہ تورات میں آپ سے متعلق درج شدہ صفات کو عملی طور پر آپ ﷺ میں دیکھ سکوں۔''(۱۵۶)

عقبہ بن علقمہ کہتا ہے: میں علی - کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ - کے سامنے سوکھی روٹی رکھی تھی، پوچھا: اے امیرالمومنین -! کیا آپ - کی غذا یہی ہے؟

فرمایا: رسول خدا ﷺ کی روٹی اس سے زیادہ خشک اور لباس میرے لباس سے زیادہ کھردرا تھا۔ اگر میں آنحضرت ﷺ کی طرح زندگی بسر نہ کروں تو مجھے ڈر ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ﷺ سے ملحق نہ ہوسکوں۔''(۱۵۷)

جب امام زین العابدین علی ابن الحسین - سے پوچھا گیا کہ آپ - کی عبادت کو امیرالمومنین - کی عبادت سے کیا نسبت ہے؟ آپ - نے فرمایا: ''میری عبادت کو میرے جد کی عبادت سے وہی نسبت حاصل ہے جو میرے جد کی عبادت کو رسول خدا ﷺ کی عبادت سے نسبت تھی۔''(۱۵۸)

زندگی کے آخری لحات میں بھی اپنے قاتل سے درگزر کرتے ہوئے صفاتِ الٰہی کو اپنانے کا ایسا نمونہ پیش کیا جو خدا کی رحمت رحمانیہ کے ظہور کا عملی نمونہ ہے۔(۱۵۹) ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاکَ إِلاَّ رَحْمَةً لِلْعَالَمِینَ﴾(۱۶۰) اور فقط اسی کو

یہ کہنے کا حق ہے کہ ((إنما بعثت لأتمم مکارم الأخلاق))(۱۶۱)

ایسی شخصیت کے اخلاقی فضائل کی شرح کہاں ممکن ہے جس کے بارے میں خداوند عظیم نے یہ فرمایا ہو کہ ﴿وَإِنَّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیمٍ﴾(۱۶۲)

آپ ﷺ کی زندگی سے اخلاق وکردار کا مطالعہ وتحقیق، ہر باانصاف شخص کے لئے آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان کے لئے کافی ہے ﴿یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاکَ شَاهِداً وَمُبَشِّراً وَنَذِیْراً ۝ وَدَاعِیاً إِلَی اللّٰهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجاً مُنِیْراً﴾(۱۶۳)

اور یہ آسمانی کتب کی ان بشارتوں کا ظہور ہے جن کی سابقہ انبیاء علیہم السلام نے خبر دی تھی۔ اگر چہ تحریف کے ذریعے انہیں مٹانے کی مکمل کوشش کی گئی لیکن باقی ماندہ اثرات میں غور وفکر، اہل نظر کو حقائق تک پہنچانے کے لیے مشعل راہ ہے۔ ہم ان میں سے دو نمونوں پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔ تورات، سفر تثنیہ، تینتیسویں باب میں ذکر ہوا ہے: ''اور یہ ہے وہ برکت جو موسیٰ جیسے مرد خدا نے اپنی وفات سے پہلے بنی اسرائیل کو عطا کی اور کہا: یہوہ سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع کیا اور جبل فاران سے چمکا اور لاکھوں مقدسین کے ساتھ آیا اور اس کے دائیں ہاتھ سے ان کے لئے آتشیں شریعت ظاہر ہوئی۔''

''سینا'' وہ جگہ ہے جہاں حضرت موسیٰ بن عمران پر وحی نازل ہوئی۔ ''سعیر'' عیسیٰ بن مریم کے مبعوث ہونے کی جگہ اور ''فاران'' کا پہاڑ جہاں یہوہ چمکا، تورات کی گواہی کے مطابق ''مکہ'' کا پہاڑ ہے۔

کیونکہ سفر تکوین کے اکیسویں باب میں حضرت ہاجرہ اور اسماعیل سے مربوط آیات میں مذکور ہے کہ: ''خدا اس بچے کے ساتھ تھا اور وہ پروان چڑھ کر، صحرا کا ساکن ہوا اور تیر اندازی میں بڑا ہوا اور فاران کے صحرا میں سکونت اختیار کی، اس کی ماں نے اس کے لئے مصر سے بیوی کا انتخاب کیا۔''

''فاران'' مکہ معظمہ ہے، جہاں حضرت اسماعیل اور ان کی اولاد رہائش پزیر تھے اور کوہ حرا سے آتشیں شریعت اور فرمان ﴿یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ﴾(۱۶۴) کے ساتھ آنے والا پیغمبر آنحضرت ﷺ کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟

اور کتاب حبقوق (حبقوق) نبی کے تیسرے باب میں نقل ہوا ہے کہ: ''خدا تیمان سے آیا اور قدوس فاران سلاہ کے پہاڑ سے، اس کے جلال نے آسمانوں کو ڈھانپ لیا اور زمین اس کی تسبیح سے لبریز ہو گئی، اس کا پرتو نور کی مثل تھا

اوراس کے ہاتھوں سے شعاع پھیلی۔''

مکہ معظمہ کے پہاڑ سے آنحضرت ﷺ کے ظہور کی بدولت ہی یہ ہوا کہ ساری زمین ((سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر)) کی صداؤں سے گونج اٹھی اور ((سبحان ربی العظیم وبحمدہ)) و ((سبحان ربی الأعلی وبحمدہ)) ساری دنیا کے مسلمانوں کے رکوع وسجود میں منتشر ہوئے۔

۲۔ انجیل یوحنا کے چودھویں باب میں مذکور ہے کہ: ''اور میں اپنے والد سے چاہوں گا اور وہ تمہیں ایک اور تسلی دینے والا عطا کرے گا جو ہمیشہ کے لئے تمہارے ساتھ رہے۔''

اور پندرھویں باب میں مذکور ہے کہ: ''اور جب وہ تسلی دینے والا آئے ، جسے والد کی جانب سے تمہارے لئے بھیجوں گا یعنی حقیقی روح جو والد سے صادر ہوگی ، وہ میری گواہی دے گی۔''

اصلی نسخے کے مطابق ، عیسیٰ جس کے متعلق خدا سے سوال کریں گے ، کو ''پارقلیطا'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے جو ''پریکلیطوس'' ہے اوراس کا ترجمہ ''تعریف کیا گیا''، ''احمد'' اور ''محمد'' کے موافق ہے ، لیکن ''انجیل'' لکھنے والوں نے اسے ''پاراکلیطوس'' میں تبدیل کر کے ''تسلی دینے والا'' کے معنی میں بیان کیا ہے۔

اور یہ حقیقت انجیل برنابا کے ذریعے واضح وآشکار ہوگئی کہ اس میں ''فصل ۱۱۲'' میں نقل ہوا ہے کہ: ''((۱۳)) اور اے برنابا ! جان لو کہ اس لئے میرے اوپر اپنی نگہداری واجب ہے اور نزدیک ہے کہ (عنقریب) میرا ایک شاگرد مجھے تیس کپڑوں کے عوض نقد بیچ دے گا ((۱۴)) اور لہذا مجھے یقین ہے کہ مجھے بیچنے والا میرے نام پر مارا جائے گا ((۱۵)) کیونکہ خدا مجھے زمین سے اٹھالے گا اور اس خائن کی صورت اس طرح بدل دے گا کہ ہر شخص گمان کرے گا کہ میں ہوں ((۱۶)) اوراس کے ساتھ جو وہ بدترین موت مرے گا میں بچ جاؤں گا اور دنیا میں دراز مدت تک رہوں گا ((۱۷)) لیکن جب محمد پیغمبر خدا ((محمد رسول اللّٰہ)) آئے گا مجھ سے یہ عیب اٹھالیا جائے گا''۔

اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بشارت انجیل کی فصول میں ذکر ہوئی ہیں۔

اور اس انجیل کی بعض فصول میں ((محمد رسول اللّٰہ)) کے عنوان سے بشارتیں مذکور ہیں ، جیسا کہ انتالیسویں فصل میں ہے: ''اور جب آدم اپنے قدموں پر کھڑا ہوا تو اس نے فضا میں کلمات لکھے ہوئے دیکھے جو سورج کی طرح چمک رہے تھے کہ جن کی صریح نص یہ تھی ((لا الہ الااللّٰہ)) اور ((محمد رسول اللّٰہ)) ((۱۵)) پس اس وقت آدم نے لب کھولے اور کہا: اے پروردگار ! میرے خدا میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کیونکہ مجھے زندگی عطا کر کے تو نے اپنا تفضل فرمایا ((۱۶)) لیکن تیری بارگاہ میں فریاد کرتا ہوں کہ تو مجھے ان کلمات ((محمد

رسول اللّٰہ)) کے معنی بتا دے((۱۷))پس خدا نے جواب دیا: مرحبا! اے میرے عبد آدم((۱۸)) بے شک میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم پہلے شخص ہوئے جسے میں نے خلق کیا ہے۔"

اور اکتالیسویں فصل میں ہے: "((۳۳))جب آدم نے توجہ کی تو دروازے کے اوپر((لا الہ الا اللّٰہ ،محمد رسول اللّٰہ)) لکھا ہوا دیکھا۔"

اور چھیانویں فصل میں ہے: "((۱۱))اس وقت خدا جہان پر رحم فرمائے گا اور اپنے پیغمبر کو بھیجے گا، جس کے لئے ساری دنیا خلق کی ہے۔((۱۲))جو قوت کے ساتھ جنوب کی جانب سے آئے گا اور بتوں اور بت پرستوں کو ہلاک کردے گا۔((۱۳))اور شیطان کے انسان پر تسلط کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا((۱۴))اور خدا کی رحمت سے خود پر ایمان لانے والوں کی خلاصی کے لیے آئے گا((۱۵))اور جو اس کے سخن پر ایمان لائے گا بابرکت ہوگا۔"

اور ستانویں فصل میں ہے: "((۱))اور اس کے باوجود کے میں اس کے جوتوں کے تسمے کھولنے کے قابل نہیں ہوں، خدا کی رحمت سے اس کی زیارت سے شرفیاب ہوا ہوں۔"

تورات اور انجیل کی بشارتوں کو ثابت کرنے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ رسول خدا ﷺ نے یہودیوں، نصاریٰ اور ان کے احبار، قسیسین اور سلاطین کو اسلام کی دعوت دی۔ یہود کے اس اعتقاد کہ ﴿عُزَيْزٌ ابْنُ اللّٰهِ﴾(۱۶۵)اور نصاریٰ کے اعتقاد ﴿إِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلاثَةٍ﴾(۱۶۶)کو غلط قرار دیتے ہوئے ان کے مقابلے میں قیام کیا اور مکمل صراحت کے ساتھ اعلان کیا کہ میں وہی ہوں جس کی بشارت تورات وانجیل میں دی گئی ہے ﴿الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهُ مَكْتُوْباً عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَ الْإِنْجِيْلِ﴾(۱۶۷)﴿وَإِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ مُصَدِّقاً لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّراً بِرَسُوْلٍ يَأْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾(۱۶۸)

اگر آپ ﷺ کا دعویٰ سچا نہ ہوتا تو کیا ان دشمنوں کے سامنے جو اپنی معنوی اور مادی سلطنت کو خطرے میں دیکھ رہے تھے اور ہر کمزور پہلو کی تلاش وجستجو میں تھے، پیغمبر اکرم ﷺ کا اس قاطعیت سے اعلان کرنا ممکن تھا؟!

احبار(۱)، قسیسین (۲)، علماء یہود ونصاریٰ اور سلاطین، جنہوں نے آپ ﷺ کے مقابلے میں ہر حربے کا سہارا لیا، یہاں تک کہ جنگ اور مباہلہ سے عاجز ہو کر جزیہ دینا قبول کر لیا، پیغمبر اسلام ﷺ کے اس دعوے کے مقابلے میں

---

(۱)احبار: علمائے یہود۔ (۲)قسیسین: علمائے نصاریٰ۔

کس طرح لاچار ہوکر رہ گئے اور ان کے لئے ممکن نہ رہا کہ آنحضرت ﷺ کے اس دعوے کا انکار کرکے، آپؐ کی تمام باتوں کو سرے سے غلط ثابت کردیں! آنحضرت ﷺ کا صریح دعویٰ اور علماء وامراء یہود ونصاریٰ کا حیرت انگیز سکوت، آپ ﷺ کے عصرِ ظہور میں ان بشارتوں کے ثبوت پر برہانِ قاطع ہے۔

اگرچہ اس کے بعد حب جاہ ومقام اور مال ومتاع کی وجہ سے انہیں تحریف کے علاوہ کوئی دوسری راہ نہ سوجھی کہ جس کا نمونہ فخر الاسلام نے اپنی کتاب ''انیس الاعلام'' میں اپنے ذاتی حالات کا تذکرہ کرتے وقت پیش کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: میں ارومیہ کے گرجا گھر میں متولد ہوا اور تحصیل علم کے آخری ایام میں کیتھولک فرقے کے ایک بڑے عالم سے استفادہ کرنے کا موقع میسر ہوا۔ اس کے درس میں تقریباً چار سو سے پانچ سو افراد شرکت کرتے تھے۔ ایک دن استاد کی غیر موجودگی میں شاگردوں کے درمیان بحث چھڑ گئی۔ جب استاد کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے پوچھا بحث کیا تھی؟ میں نے کہا: ''فارقلیط'' کے معنی کے بارے میں۔ استاد نے اس بحث میں شاگردوں کے نظریات معلوم کرنے کے بعد کہا: ''حقیقت کچھ اور ہے''، پھر اس مخزن کی جسے میں اس کا خزانہ تصور کرتا تھا، چابی مجھے دی اور کہا: ''اس صندوق میں سے دو کتابیں جن میں سے ایک سریانی اور دوسری یونانی زبان میں جو حضرت خاتم الانبیاء کے ظہور سے پہلے کھال پر لکھی ہوئی ہے، لے کر آؤ۔''

پھر مجھے دکھایا کہ اس لفظ کے معنی ''احمد'' اور ''محمد'' لکھے ہوئے تھے اور مجھ سے کہا: ''حضرت محمد ﷺ کے ظہور سے پہلے عیسائی علماء میں اس کے معنی میں کوئی اختلاف نہ تھا اور آنحضرت ﷺ کے ظہور کے بعد تحریف کی''۔

میں نے نصاریٰ کے دین سے متعلق اس کا نظریہ دریافت کیا۔ اس نے کہا: ''منسوخ ہو چکا ہے۔ اور نجات کا طریقہ محمد ﷺ کی پیروی میں منحصر ہے۔'' میں نے اس سے پوچھا: ''اس بات کا تم اظہار کیوں نہیں کرتے؟''

اس نے عذر یہ بیان کیا تھا کہ اگر اظہار کروں مجھے مار ڈالیں گے اور......

اس کے بعد ہم دونوں روئے اور میں نے استاد سے یہ استفادہ کرنے کے بعد اسلامی ممالک کی طرف ہجرت کی۔ (۱۲۹)

ان دو کتابوں کا مطالعہ اس عالی مقام راہب کے روحی انقلاب کا سبب بنا اور اسلام لانے کے بعد عیسائیت کے بطلان اور حقانیتِ اسلام کے بارے میں کتاب انیس الاعلام لکھی جو عہد قدیم (۱) وجدید (۲) میں اس کے تتبع اور تحقیق کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

---

(۱) عہد قدیم: حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے نازل ہونے والی وحی اور احکامات۔

(۲) عہد جدید: وحی والہام کا وہ مجموعہ جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد تالیف کیا گیا۔

معاد

معاد پر اعتقاد دو راہوں سے حاصل ہوتا ہے: دلیل عقلی اور عقل پر مبنی دلیل نقلی

دلیل عقلی:

ا۔ ہر عاقل کی عقل یہ درک کرتی ہے کہ عالم و جاہل، اخلاق فاضلہ مثال کے طور پر بخشش و کرم سے آراستہ اور اخلاق رذیلہ مثال کے طور پر بخل وحسد سے آلودہ اور نیک و بد انسان برابر نہیں ہیں اور کسی کو اس کے عمل کے مطابق جزا و سزا نہ دینا ظلم ہے۔

اور جیسا کہ اس زندگی میں اچھے اعمال بجالانے والوں کو اچھائی کی جزا اور برے اعمال بجالانے والوں کو برائی کی سزا ملنا چاہیے نہیں ملتی، لہٰذا اگر اس کے علاوہ عقائد، اخلاق اور اعمال سے متناسب عذاب وثواب پر مشتمل کوئی دوسری زندگی نہ ہوئی تو یہ ظلم ہوگا اور اسی بناء بر حشر ونشر، حساب و کتاب اور ثواب وعقاب کا ہونا عدل پروردگار کا عین تقاضا ہے ﴿أَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ﴾(۱)

۲۔ خداوند متعال حکیم ہے لہٰذا عبث ولغو عمل اس سے صادر نہیں ہوتا، اس نے انسان کو خلق کیا اور اسے نباتات وحیوانات کے لئے ضروری صفات، مثال کے طور پر دفع وجذب اور شہوت وغضب، کے ساتھ ساتھ ایسی صفات سے مزین کیا کہ جو اسے علمی کمالات، اخلاقی فضائل اور شائستہ گفتار ورفتار کی جانب دعوت دیتی ہے۔ کمالات تک پہنچنے کے لیے کسی حد پر نہیں ٹھہرتی اور علم وقدرت کے کسی بھی مرتبے تک پہنچنے کے باوجود اگلے مراحل کی پیاس باقی رہتی ہے۔ پھر انبیاء علیہم السلام کو اسی فطرت کی تربیت کے لئے بھیجا تا کہ اسے لامتناہی کمال کی ابتداء کی جانب ہدایت کریں۔ اگر انسان کی زندگی اسی دنیا تک محدود ہوتی تو اس فطرت کا وجود اور ہدایت کے لئے انبیاء کی بعثت لغو وعبث قرار پاتی۔

لہٰذا، حکمت خداوندِ متعال کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی زندگی اسی حیات مادی وحیوانی تک ختم نہ ہو بلکہ اس کمال کو پانے کے لئے جو خلقت کا مقصد ہے آئندہ بھی جاری ہے ﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ﴾(۲)

۳۔ فطرت انسانی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہر صاحب حق کو اس کا حق اور ظالم کے مقابلے میں ہر مظلوم کو انصاف ملنا چاہیے اور یہی فطرت ہے جو ہر دین و مسلک سے تعلق رکھنے والے انسان کو، عدل و انصاف فراہم کرنے کے لئے، قوانین اور عدالتیں بنانے پر مجبور کرتی ہے۔

نیز یہ بات بھی واضح و روشن ہے کہ دنیاوی زندگی میں بہت سے ظالم، مسند عزت و اقتدار پر زندگی بسر کرتے ہیں اور مظلوم تازیانوں اور شکنجوں میں سسک سسک کر جان دے دیتے ہیں۔ حکمت، عدل، عزت اور رحمت خداوند متعال کا تقاضا یہ ہے کہ ظالموں سے ان مظلوموں کا بدلہ لیا جائے ﴿وَلاَ تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلاً عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُوْنَ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْأَبْصَارُ﴾(۲)

۴۔ حکمت خداوند متعال کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی غرضِ خلقت اور مقصد وجود تک رسائی کے لیے، اسے وسائل فراہم کرے، جو اسبابِ سعادت کے حکم اور اسبابِ شقاوت سے نہی کئے بغیر میسر نہیں۔ اسی طرح انسانی ہوئی وہوس کے مخالف قوانینِ الٰہی کا اجراء بغیر خوف ورجاء کے ممکن نہیں اور یہ دونوں بشارت وانذار کے بغیر متحقق نہیں ہو سکتے، اُدھر بشارت وانذار کا لازمہ یہ ہے کہ اس زندگی کے بعد ثواب وعقاب اور قسمت ونعمت ملے ورنہ بشارت وانذار کو جھوٹ ماننا پڑے گا، جب کہ خداوند متعال ہر قبیح سے منزہ ہے۔

دلیل نقلی:

تمام ادیان آسمانی معاد کے معتقد ہیں اور اس اعتقاد کی بنیاد پیغمبرانِ الٰہی کا خبر دینا ہے۔ ان کا خبر دینا وحی الٰہی سے مستند ہے، جب کہ عصمت انبیاء علیہم السلام اور وحی کا ہر خطاولغزش سے محفوظ ہونا معاد پر ایمان اور اعتقاد کو ضروری و واجب قرار دیتا ہے۔

معاد اور حشر ونشر کے منکرین کے پاس پیغمبروں کی اس خبر کے مقابلے میں اسے بعید الوقوع کہنے کے علاوہ کوئی دوسرا بہانہ نہ تھا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوں؟ بوسیدہ وخاک ہونے کے بعد یہ مردہ و پراگندہ ذرات آپس میں مل کر نئی زندگی کیسے پا سکتے ہیں؟

جب کہ وہ اس بات سے غافل ہیں کہ بے جان و پراگندہ اجزاء ہی سے تو زندہ موجودات کو بنایا گیا ہے۔ وہی علم، قدرت اور حکمت جس نے بے جان ومردہ مادّے کو خاص ترکیب اور مخصوص نظام کے ساتھ حیات وزندگی قبول

کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے اور جو انسان جیسے ان تمام اعضاء وقوتوں کے مجموعے کو بغیر کسی سابقہ مثال ونمونے کی موجودگی کے بنا سکتا ہے وہ انسان کے مرنے اور منتشر ہونے کے بعد اس کے تمام ذرات کو، چاہے کہیں بھی ہوں اور کسی بھی حالت میں ہوں، جو اس کے احاطہ علم ونظروں سے اوجھل نہیں، جمع کر سکتا ہے اور جس قدرت کے ساتھ پہلی مرتبہ بغیر کسی مثال ونمونے کے خلق فرمایا تھا دوسری بار نمونے اور سابقہ تجربے کے ہوتے ہوئے جو اور بھی زیادہ آسان ہے، انجام دے سکتا ہے ﴿قَالُوا أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ﴾(۴)

﴿أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ﴾(۵)

وہ قدرت جو سرسبز درختوں سے آگ کو روشن اور خزاں کی موت کے بعد مردہ زمین کو ہر بہار میں زندگی عطا کرتی ہے، اس کے لئے موت کے بعد زندگی عطا کرنا ہرگز مشکل کام نہیں ﴿الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنْتُمْ مِنْهُ تُوقِدُونَ﴾(۶) ﴿اِعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾(۷)

وہ قدرت جو ہر رات، انسان کے ادراک کی مشعل کو نیند کے ذریعے بجھاتی اور اس سے علم واختیار کو سلب کر لیتی ہے، موت کے ذریعے بجھنے کے بعد بھی اسے دوبارہ ادراک کی روشنی عطا کرنے اور فراموش شدہ معلومات کو پلٹانے پر قادر ہے ((لتموتن کما تنامون ولتبعثن کما تستیقظون))(۸)

امامت

شیعہ وسنی کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں خلیفۂ پیغمبر ﷺ کا ہونا ضروری ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ آیا پیغمبر اسلام ﷺ کے خلیفہ کی خلافت انتصابی ہے یا انتخابی۔

اہلسنت کا عقیدہ ہے کہ خدا اور رسول ﷺ کی جانب سے کسی کے معین کئے جانے کی ضرورت نہیں بلکہ خلیفۂ رسول امت کے انتخاب سے معین ہو جاتا ہے جب کہ شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے انتخاب کے بغیر جو درحقیقت خدا کی جانب سے انتخاب ہے، کوئی بھی فرد خلافت کے لئے معین نہیں ہو سکتا۔

اس اختلاف میں حاکمیت عقل، قرآن اور سنت کے ہاتھ ہے۔

الف۔ قضاوتِ عقل

اور اس کے لئے تین دلیلیں کافی ہیں:

۱۔ اگر ایک موجد ایسا کارخانہ بنائے جس کی پیداوار قیمتی ترین گوہر ہو اور اس ایجاد کا مقصد پیداوار کے اس سلسلے کو ہمیشہ باقی رکھنا ہو، یہاں تک کہ موجد کے حضور وغیاب اور زندگی وموت، غرض ہر صورت میں اس کام کو جاری رکھنا نہایت ضروری ہو، جب کہ اس پیداوار کے حصول کے لئے، اس کارخانے کے آلات کی بناوٹ اور ان کے طریقہ کار میں ایسی ظرافتوں اور باریکیوں کا خیال رکھا گیا ہو جن کے بارے میں اطلاع حاصل کرنا، اس موجد کی رہنمائی کے بغیر ناممکن ہو، کیا یہ بات قابل یقین ہے کہ وہ موجد اس کام کے لئے ایک ایسے دانا شخص کو معین نہ کرے جو اس کارخانے کے آلات کے تمام رازوں سے باخبر ہو اور ان کے صحیح استعمال سے واقف ہو؟! بلکہ اس کارخانے کے انجینیر کے انتخاب کا حق مزدوروں کو دے دے جو ان آلات سے نا آشنا اور ان دقتوں اور باریکیوں سے ناواقف ہیں؟!

وہ باریک بینی جس کا انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں جاری ہونے والے الٰہی قوانین، سنن اور تعلیمات میں خیال رکھا گیا ہے جو کارخانہ دین خدا کے آلات واوزار ہیں، کہ جس کارخانے کی پیداوار، خزانہ وجود کا قیمتی ترین گوہر، یعنی انسانیت کو معرفت وعبادت پروردگار کے کمال تک پہنچانا اور شہوت انسانی کو عفت، غضب کو شجاعت اور فکر کو حکمت کے ذریعے توازن دے کر، انصاف وعدالت پر مبنی معاشرے کا قیام ہے، کیا مذکورہ موجد کے ایجاد کردہ کارخانے میں جاری ہونے والی باریکی اور دقت نظری سے کم ہے؟!

جس کتاب کی تعریف میں خداوند متعال نے فرمایا﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْکَ الْکِتَابَ تِبْيَانًا لِکُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً﴾(۱) اور﴿کِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾(۲) اور﴿وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْکَ الْکِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ﴾(۳) اس کتاب کے لئے ایسے مبیّن کا ہونا ضروری ہے جو اس کتاب میں موجود ہر اس چیز کا استخراج کر سکے جس کے لئے یہ کتاب تبیان بن کر آئی ہے، ایک ایسا فرد جو انسان کے فکری، اخلاقی اور عملی ظلمات پر احاطہ رکھتے ہوئے، عالم نور کی جانب انسان کی رہنمائی کر سکے، جو نوع انسان کے تمام تر اختلافات میں حق و باطل کو بیان کر سکتا ہو، کہ جن اختلافات کی حدود مبداء ومعاد سے مربوط وجود کے عمیق

ترین ایسے مسائل، جنہوں نے نابغہ ترین مفکرین کو اپنے حل میں الجھا رکھا ہے، سے لے کر مثال کے طور پر ایک بچے کے بارے میں دو عورتوں کے جھگڑے تک ہے جو اس بچے کی ماں ہونے کی دعویدار ہیں۔

کیا یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ عمومی ہدایت، انسانی تربیت، مشکلات کے حل اور اختلافات کے مٹانے کے لئے قرآن کی افادیت، پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے ساتھ ختم ہوگئی ہو؟!

آیا خدا اور اس کے رسول ﷺ نے اس قانون اور تعلیم و تربیت کے لئے کسی مفسر و معلم اور مربی کا انتظام نہیں کیا؟! اور کیا اس مفسر و معلم و مربی کو معین کرنے کا اختیار، قران کے علوم و معارف سے بے بہرہ لوگوں کو دے دیا ہے؟!

۲۔ انسان کی امامت و رہبری یعنی عقلِ انسان کی پیشوائی و امامت، کیونکہ امامت کی بحث کا موضوع "انسان کا امام ہے" اور انسان کی انسانیت اس کی عقل و فکر سے ہے ((دعامة الإنسان العقل))(۲)

خلقت انسانی کے نظام میں بدن کی قوتیں اور اعضاء، حواس کی رہنمائی کے محتاج ہیں، اعصاب حرکت کو اعصاب حس کی پیروی کی ضرورت ہے اور خطا و درنگی میں حواس کی رہبری عقلِ انسانی کے ہاتھ ہے، جب کہ محدود ادراک اور خواہشاتِ نفسانی سے متاثر ہونے کی وجہ سے خود عقلِ انسان کو ایسی عقلِ کامل کی رہبری کی ضرورت ہے جو بیماری وعلاج اور انسانی نقص و کمال کے عوامل پر مکمل احاطہ رکھتی ہو اور خطا و ہوئی سے محفوظ ہو، تا کہ اس کی امامت میں انسانی عقل کی ہدایت تحقق پیدا کر سکے اور ایسی کامل عقل کی معرفت کا راستہ یہی ہے کہ خدا اس کی شناخت کروائے۔ اس لحاظ سے امامت کی حقیقت کا تصور، خدا کی جانب سے نصب امام کی تصدیق سے جدا نہیں۔

۳۔ چونکہ امامت قوانین خدا کی حفاظت، تفسیر اور ان کا اجراء ہے، لہذا جس دلیل کے تحت قوانین الٰہی کے مبلغ کا معصوم ہونا ضروری ہے اسی دلیل سے محافظ، مفسر اور قوانین الٰہی کے اجراء کنندہ کی عصمت بھی ضروری ہے اور جس طرح ہدایت، جو کہ غرض بعثت ہے، اس وقت باطل ہو جاتی ہے جب مبلّغ میں خطا و ہوئی آجاتی ہے، اسی طرح مفسر و مجری قوانین الٰہی کا خطا کار ہونا اور خواہشات کے زیر اثر آجانا، اضلال و گمراہی کا سبب ہے اور معصوم کی پہچان خداوندِ متعال کی رہنمائی کے بغیر ناممکن ہے۔

ب۔ تضاوت قرآن:

اختصار کی وجہ سے تین آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

پہلی آیت:

﴿وَ جَعَلْنَا مِنهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَ كَانُوْا بِآيَاتِنَا يُوْقِنُوْنَ﴾(۵)

ہر درخت کی شناخت اس کی اصل وفرع، جڑ اور پھل سے ہوتی ہے۔شجر امامت کی اصل وفرع، قرآن مجید کی اس آیت میں بیان ہوئی ہے۔

صبر اور آیات خداوند کریم پر یقین، امامت کی اصل ہے اور یہ دو لفظ انسان کے بلند ترین مرتبہ کمال کو بیان کرتے ہیں کہ کمال عقلی کی بناء پر ضروری ہے کہ امام معرفت الٰہی اور آیات ربانی ۔ کہ جن آیات کو صیغۂ جمع کے ساتھ ذات قدوس الٰہیہ کی جانب نسبت دی ہے۔ کے لحاظ سے یقین کے مرتبہ پر اور ارادے کے اعتبار سے مقام صبر پر، جو نفس کو مکروہات خدا سے دور اور اس کے پسندیدہ اعمال پر پابند کردینے کا نام ہے، فائز ہو اور یہ دو جملے امام کے علم اور اس کی عصمت کے بیان گر ہیں۔

فرع امامت، امر خدا کے ذریعے ہدایت کرنا ہے اور امر الٰہی کے ذریعے ہدایت سے عالم خلق اور عالم امر کے مابین وساطتِ امام ثابت ہوتی ہے اور خود یہی فرع جو اس اصل کا ظہور ہے، امام کے علم وعصمت کی آئینہ دار ہے۔

وہ شجرہ طیبہ جس کی اصل وفرع یہ ہوں، اس کی پرورش قدرت خدا کے بغیر ناممکن ہے، اسی لئے فرمایا: ﴿وَ جَعَلْنَا مِنهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَ كَانُوْا بِآيَاتِنَا يُوْقِنُوْنَ﴾

دوسری آیت:

﴿وَاِذِ ابْتَلٰى اِبْرَاهِيْمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِيْنَ﴾(۶)

امامت وہ بلند مقام ومنصب ہے جو حضرت ابراہیم ۔ کو کٹھن آزمائشوں، مثال کے طور پر خدا کی راہ میں بیوی اور

بچے کو بے آب وگیاہ بیابان میں تنہا چھوڑنے، حضرت اسماعیل کی قربانی اور آتش نمرود میں جلنے کے لئے تیار ہونے، اور نبوت و رسالت وخلت جیسے عظیم مراتب طے کرنے کے بعد نصیب ہوا اور خداوند متعال نے فرمایا ﴿إِنِّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾ اس مقام کی عظمت نے آپ کی توجہ کو اتنا زیادہ مبذول کیا کہ اپنی ذریت کے لئے بھی اس مقام کی درخواست کی تو خداوند متعال نے فرمایا ﴿لاَ یَنَالُ عَهْدِی الظَّالِمِیْنَ﴾

اس جملے میں امامت کو خداوند متعال کے عہد سے تعبیر کیا گیا ہے جس پر صاحب عصمت کے علاوہ کوئی دوسرا فائز نہیں ہوسکتا اور اس میں بھی شک وتردید نہیں کہ حضرت ابراہیم - نے اپنی پوری کی پوری نسل کے لئے امامت نہیں چاہی ہوگی کیونکہ یہ بات ممکن ہی نہیں کہ خلیل اللہ نے عادل پروردگار سے کسی غیر عادل کے لئے انسانیت کی امامت کو طلب کیا ہو، لیکن چونکہ حضرت ابراہیم - نے اپنی عادل ذریت کے لئے جو درخواست کی تھی، اس کی عمومیت کا دائرہ ذریت کے اس فرد کو بھی شامل کر رہا تھا جس سے گذشتہ زمانے میں ظلم سرزد ہو چکا ہو. لہٰذا خدا کی جانب سے دئے گئے جواب کا مقصد یہ تھا کہ ایسے عادل کے حق میں آپ کی یہ دعا مستجاب نہیں جن سے پہلے گناہ سرزد ہو چکے ہیں بلکہ حکم عقل وشرع کے مطابق امامت مطلقہ کے لیے عصمت وطہارت مطلقہ شرط ہیں۔

تیسری آیت:

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا أَطِیْعُوْا اللّٰهَ وَأَطِیْعُوْا الرَّسُوْلَ وَأُوْلِی الْأَمْرِ مِنْکُمْ﴾(۷)

اس آیت کریمہ میں اولی الامر کو رسول پر عطف لیا گیا ہے اور دونوں میں ایک ﴿أطیعوا﴾ پر اکتفا کرنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اطاعت اولی الامر اور اطاعت رسول ﷺ کے وجوب کی سنخ وحقیقت ایک ہی ہے اور اطاعت رسول ﷺ کی طرح، جو وجوب میں بغیر کسی قید وشرط اور واجب میں بغیر کسی حد کے، لازم وضروری ہے اور اس طرح کا وجوب ولیِ امر کی عصمت کے بغیر ناممکن ہے، کیونکہ کسی کی بھی اطاعت اس بات سے مقید ہے کہ اس کا حکم، اللہ تعالی کے حکم کا مخالف نہ ہو اور عصمت کی وجہ سے معصوم کا فرمان، خدا کے فرمان کے مخالف نہیں ہوسکتا، لہٰذا اس کی اطاعت بھی تمام قیود وشرائط سے آزاد ہے۔

اس اعتراف کے بعد کہ امامت، درحقیقت دین کے قیام اور مرکزِ ملت کی حفاظت کے لئے، رسول ﷺ کی ایسی جانشینی کا نام ہے کہ جس کی اطاعت وپیروی پوری امت پر واجب ہے (۸) اور ﴿إِنَّ اللّٰهَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ

وَالْإِحْسَانِ ﴾(۹) ﴿يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾(۱۰) کے مطابق اگر ولی امر معصوم نہ ہو تو اس کی اطاعتِ مطلقہ کا لازمہ یہ ہے کہ خدا ظلم و منکر کا امر کرے اور عدل و معروف سے نہی کرے۔

اس کے علاوہ، ولی امر کے غیر معصوم ہونے کی صورت میں عین ممکن ہے کہ اس کا حکم خدا اور رسول کے فرمان سے ٹکرائے اور اس صورت میں اطاعتِ خدا و رسول ﷺ اور اطاعت ولی امر کا حکم، اجتماع ضدین اور ایک امر محال ہوگا۔

لہٰذا، نتیجہ یہ ہوا کہ کسی قید و شرط کے بغیر اولی الامر کی اطاعت کا حکم، اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا حکم خدا اور رسول کے فرمان کے مخالف نہیں ہے اور خود اسی سے عصمت ولی امر بھی ثابت ہو جاتی ہے۔

اور یہ کہ معصوم کا تعین عالم السر والخفیات کے علاوہ کسی اور کے لیے ممکن نہیں ہے۔

ج۔ قضاوت سنت:

سنت رسول کی پیروی، ادراک عقل کے تقاضے اور حکم کتاب خدا کے مطابق ہے کہ معصوم کی پیروی کرنا ضروری ہے ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾(۱۱)

اور ہم سنت میں سے فقط ایک ایسی حدیث بیان کریں گے جس کا صحیح ہونا مسلّم اور فرمان خدا کے مطابق اس کا قبول کرنا واجب ہے۔ اس حدیث کو فریقین نے رسول خدا ﷺ سے نقل کیا ہے اور آنحضرت ﷺ سے صادر ہونے کی تصدیق بھی کی ہے۔ اگر چہ اس حدیث کو متعدد سلسلہ ہائے اسناد کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، لیکن ہم اسی ایک پر اکتفا کرتے ہیں جس کا سلسلہ سند زیادہ معتبر ہے۔ اور وہ روایت زید بن ارقم سے منقول ہے: ((قال: لما رجع رسول اللّٰہ ﷺ من حجة الوداع ونزل غدیر خم أمر بدوحات فقمن، فقال: کأنی قد دعیت فأجبت، إنی قد ترکت فیکم الثقلین أحدھما أکبر من الآخر کتاب اللّٰہ و عترتی فانظروا کیف تخلفونی فیھما، فإنھما لن یتفرقا حتی یردا علیّ الحوض، ثم قال: إن اللّٰہ عزّ و جلّ مولای و أنا مولی کل مؤمن، ثم أخذ بید علی رضی اللّٰہ عنه فقال: من کنت مولاہ فھذا ولیه، اللّٰھم وال من والاہ و عاد من عاداہ، وذکر الحدیث بطوله))(۱۲)

امت کی امامت آنحضرت ﷺ کی نگاہ میں اتنی زیادہ اہمیت کی حامل تھی کہ آپ ﷺ نے نہ صرف حجۃ الوداع سے لوٹتے وقت بلکہ مختلف مواقع پر، حتی زندگی کے آخری لمحات میں موت کے بستر پر، جب اصحاب بھی آپ کے

کرے میں موجود تھے، کتاب وعترت کے بارے میں وصیت فرمائی، کبھی ((انی قد ترکت فیکم الثقلین))(۱۳) اور کبھی ((انی تارک فیکم خلیفتین))، (۱۴) بعض اوقات ((انی تارک فیکم الثقلین))(۱۵) کے عنوان سے اور کسی وقت ((لن یفترقا))(۱۶) اور کبھی ((لن یتفرقا))(۱۷) کی عبارت کے اضافے کے ساتھ اور بعض مناسبتوں پر ((لا تقدموهما فتهلكوا ولا تعلموهما فإنهما أعلم منكم))(۱۸) اور کبھی اس طرح گویا ہوئے ((إني تارک فيكم أمرين لن تضلوا إن اتبعتموهما))(۱۹)

اگر چہ کلام رسول خدا ﷺ میں موجود تمام نکات کو بیان کرنا تو میسر نہیں، لیکن چند نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ جملہ ((انی قد ترکت)) اس بات کو بیان کرتا ہے کہ امت کے لئے آنحضرت ﷺ کی طرف سے قرآن وعترت بطور ترکہ ومیراث ہے، کیونکہ پیغمبر اسلام ﷺ کو امت کی نسبت باپ کا درجہ حاصل ہے، اس لئے کہ انسان جسم وجان کا مجموعہ ہے اور روح کو جسم سے وہی نسبت ہے جو معنی کو لفظ اور مغز کو چھلکے سے ہے۔ اعضاء اور جسمانی قوتیں انسان کو اپنے جسمانی باپ سے ملی ہیں اور عقائد حقہ، اخلاق فاضلہ واعمال صالحہ کے ذریعے میسر ہونے والے روحانی اعضاء وقوتیں، پیغمبر ﷺ کے طفیل نصیب ہوئی ہیں، جو انسان کے روحانی باپ ہیں۔

روحانی سیرت وعقلانی صورت کے افاضے کا وسیلہ اور مادی صورت وجسمانی ہیئت کے افاضے کا واسطہ، آپس میں قابل قیاس نہیں ہیں، جس طرح مغز کا چھلکے سے، معنی کا لفظ سے اور موتی کا سیپ سے کوئی مقابلہ نہیں۔

ایسا باپ اپنے اس جملے ((کأني قد دعيت فاجبت)) سے اپنی رحلت کی خبر دینے کے ساتھ ساتھ اپنی اولاد کے لیے میراث وترکہ معین فرما رہا ہے کہ امت کے لئے میرے وجود کا حاصل اور باقی دو چیزیں ہیں ((كتاب الله وعترتي))

قرآن امت کے ساتھ خدا، اور عترت امت کے ساتھ رسول ﷺ کا رابطہ ہیں۔ قرآن سے قطع رابطہ خدا سے ساتھ قطع رابطہ اور عترت سے قطع رابطہ پیغمبر اکرم ﷺ کے ساتھ قطع رابطہ ہے اور پیغمبر خدا سے قطع رابطہ خود خدا سے قطع رابطہ ہے۔

اضافہ کی خصوصیت یہ ہے کہ مضاف، مضاف الیہ سے کسب حیثیت کرتا ہے۔ اگر چہ قرآن کا خدا کی جانب اور

عترت کا پیغمبر خاتم ﷺ، جو کائنات کے شخص اول ہیں، کی طرف اضافہ، قرآن وعترت کے مقام ومنزلت کو واضح وروشن کر رہا ہے لیکن مطلب کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے ان دو کو ثقلین سے تعبیر کیا ہے جس سے پیغمبر اکرم ﷺ کی اس میراث کی اہمیت اور سنگینی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

قرآن کے معنوی وزن کی سنگینی اور نفاست، ادراک عقول سے بالاتر ہے، اس لئے کہ قرآن مخلوق کے لیے خالق کی تجلی ہے اور عظمت قرآن کو درک کرنے کے لئے یہ چند آیات کافی ہیں ﴿یٰسٓ۝وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ﴾(۴۰)، ﴿قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ﴾(۴۱)، ﴿إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ۝فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ۝لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ﴾(۴۲)، ﴿لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾(۴۳)

اور عترت وقرآن کو ایک ہی وصف سے توصیف کرنا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ کلام رسول اللہ ﷺ کے مطابق عترت، قرآن کی ہم پلہ وشریک وحی ہے۔

پیغمبر خاتم ﷺ کے کلام میں، جو میزان حقیقت ہے، عترت کا ہمسر قرآن ہونا ممکن نہیں مگر یہ کہ عترت ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾(۴۴) میں شریک علم اور ﴿لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ﴾(۴۵) میں شریک عصمت قرآن ہو۔

۲۔ جملہ ((فإنهما لن يفترقا)) قرآن وعترت کے لازم وملزوم اور ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی ان دونوں میں جدائی ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے کہ قرآن ایسی کتاب ہے جو تمام بنی نوع انسان کی مختلف ظرفیتوں اور قابلیتوں کے حساب سے نازل ہوئی ہے جس میں عوام کے لیے عبارات، علماء کے لیے اشارات، اولیاء کے لیے لطیف نکات اور انبیاء کے لیے حقائق بیان ہوئے ہیں اور بنی نوع انسان کے پست ترین افراد، جن کا کام فقط مادی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے، سے لے کر بلند مرتبہ افراد، جن کے روحی اضطراب کو ذکر خدا کے بغیر اطمینان حاصل نہیں ہوتا اور جو ہمیشہ اسمائے حسنی، امثال علیا اور تجلی اسم اعظم کی تلاش میں ہیں، کو اس کی ہدایت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔

اور یہ کتاب سورج کی مانند ہے کہ ٹھنڈک محسوس کرنے والا اس کی حرارت سے خود کو گرم کرتا ہے، کاشتکار اس

کے ذریعے اپنی زراعت کی پرورش چاہتا ہے، ماہر طبیعیات اس کی شعاعوں کا تجزیہ اور معادن ونباتات کی پرورش میں اس کے آثار کی جستجو کرتا ہے اور عالم ربانی دنیا وما فیہا میں سورج کی تاثیر، طلوع وغروب اور قرب وبعد میں موجود سنن وقوانین کے ذریعے اپنے گمشدہ کو پاتا ہے، جو سورج کا خالق ومدبر ہے۔

ایسی کتاب کے لئے، جو تمام بنی نوع انسان کے لیے ہے اور دنیا وبرزخ وآخرت میں انسانیت کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہے، ایسے معلم کی ضرورت ہے جو ان تمام ضرورتوں کا علم رکھتا ہو، کیونکہ طبیب کے بغیر طب، معلم کے بغیر علم اور مفسر کے بغیر زندگی ومعاد کو منظم کرنے والا الٰہی قانون ناقص ہیں اور نہ فقط یہ بات ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾(۲۲) کے ساتھ سازگار نہیں بلکہ قرآن کے نزول سے نقضِ غرض لازم آتی ہے اور ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَاناً لِكُلِّ شَيْءٍ﴾(۲۷) کے ساتھ قابل جمع نہیں ہے۔ جب کہ حکیم وکامل علی الاطلاق سے قبیح ہے کہ دین کو ناقص بیان کرے اور محال ہے کہ نقض غرض کرے، اسی لئے فرمایا((لن يتفرقا))

۳۔ ایک روایت کے مطابق فرمایا((يا أيها الناس إني تارك فيكم أمرين لن تضلوا إن اتبعتموهما)) اور جیسا کہ سابقہ مباحث میں اشارہ کیا جاچکا ہے کہ خلقت کے اعتبار سے انسان، جو موجودات جہان کا نچوڑ اور دینوی، برزخی، اخروی، ملکی وملکوتی موجود ہونے کی وجہ سے عالم خلق وامر سے وابستہ ہے اور ایسی مخلوق ہے جو بقا کے لئے ہے نہ کہ فنا کے لئے، ایسے انسان کی ہدایت، سعادت ابدی اور اس کی گمراہی شقاوت ابدی کا باعث ہوسکتی ہے اور یہ تعلیم وتربیت، وحی الٰہی کی ہدایت کے بغیر ناممکن ہے، جو ظلمات کے مقابلے میں نور مقدس ہے ﴿قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَكِتَابٌ مُبِيْنٌ﴾(۲۸) اور قانون تناسب وسنخیت کے مطابق، معلم قرآن کا بھی خطا سے معصوم ہونا ضروری ہے، کیونکہ انسان، باعصمت ہدایت اور معصوم ہادی کے ساتھ تمسک کے ذریعے ہی فکری، اخلاقی وعملی گمراہیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے، لہذا آپ ﷺ نے فرمایا((لن تضلوا إن اتبعتموهما)).

۴۔ اور آپ ﷺ کے اس جملے((ولا تعلموهما فإنهما أعلم منكم)) کے بارے میں ایک انتہائی متعصب سنی عالم کا یہ قول ہی کافی ہے کہ((وتميزوا بذلک عن بقية العلماء لأن الله أذهب عنهم الرجس وطهرهم تطهيرا)) یہاں تک کہ کہتا ہے((ثم أحق من يتمسک به منهم إمامهم و عالمهم علي بن ابي طالب كرم الله وجهه لما قدمناه من مزيد علمه و دقائق مستنبطاته ومن ثم قال أبوبكر: علي

عترة رسول اللّٰہ ای الذین حث علی التمسک بھم، فخصه لما قلنا، وكذلک خصه بما مر يوم غدير خم))(۲۹)

اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ اس تصدیق کے باوجود کہ آیت تطہیر کی وجہ سے علی -باقی تمام علماء سے افضل ہیں، کیونکہ اس آیت کے مطابق رجس سے بطور مطلق پاک ہیں، اور اس اقرار کے باوجود کہ پیغمبر اکرم ﷺ علی -کو باقی تمام امت سے اعلم شمار فرماتے تھے اور خدا بھی فرماتا ہے ﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ﴾(۳۰) اور ﴿أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمَّنْ لَا يَهِدِّي إِلَّا أَنْ يُهْدَى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ﴾(۳۱) اور اس حدیث ((إنی تارک فیکم أمرین لن تضلوا إن اتبعتموهما وهما کتاب اللّٰہ و أهل بیتی عترتی)) کے صحیح ہونے کے اعتراف کے ساتھ، ضلالت وگمراہی سے نجات پانے کے لئے پوری امت کو علی -کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے اور اس طرح علی -کی متبوعیت وعموم امت کی تابعیت کے بارے میں بغیر کسی استثناء کے حجت قائم ہے ﴿قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾(۳۲)

۵۔ قانون کو بیان کرنے کے بعد مصداق کو معین کرنے کی غرض سے حضرت علی -کا ہاتھ پکڑ کر آپ کی تعارف کروایا کہ یہ وہی ثقل ہے جو قرآن سے ہرگز جدا نہ ہوگا اور اس کی عصمت، ہدایت امت کی ضامن ہے اور جس طرح پیغمبر ﷺ تمام مومنین کے مولا ہیں اسی طرح علی -کا مولا ہونا بھی ثابت ہے ﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ﴾(۳۳)

اگرچہ خلافت، امامت عامہ اور امامت خاصہ کا مسئلہ عقل، کتاب اور سنت کے حکم سے روشن ہو چکا ہے اور امام کے لئے ضروری اوصاف، ائمہ معصومین علیہم السلام کے علاوہ کسی اور میں نہیں پائے جاتے، لیکن اتمام حجت کے پیش نظر، حدیث ثقلین کے علاوہ، حضرت سید الوصیین امیر المؤمنین -کی شان میں چند اور احادیث کو پیش کیا جا رہا ہے جن کا صحیح ہونا محدثین کے نزدیک ثابت ومسلم ہے۔

پہلی حدیث

عن ابی ذر رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: ((من اطاعنی فقد اطاع اللّٰہ ومن عصانی فقد عصی اللّٰہ ومن اطاع علیا فقد اطاعنی ومن عصی علیا فقد عصانی))(۳۴)

اس حدیث میں، جس کے صحیح ہونے کی اکابر اہل سنت تصدیق کرتے ہیں ہے، بحکم فرمان رسول ﷺ، جس کی عصمت گفتار کا تذکرہ خداوند متعال نے قرآن میں کیا ہے اور اس بات پر عقلی دلیل بھی قائم ہو چکی ہے، علی - کی اطاعت وعصیان دراصل اطاعت وعصیان پیغمبر ﷺ ہے اور اطاعت وعصیان پیغمبر ﷺ دراصل خدا کی اطاعت وعصیان قرار پاتی ہے۔

اس توجہ کے ساتھ کہ اطاعت وعصیان کا تعلق امر ونہی سے ہے اور امر ونہی کی وجہ ارادہ وکراہت ہے، لہذا علی - کی اطاعت وعصیان کا خدا کی اطاعت وعصیان قرار پانا اسی وقت ممکن ہے جب علی - کا ارادہ وکراہت، خدا کے ارادے وکراہت کا مظہر ہو۔

اور جس کا ارادہ وکراہت، خدا کے ارادے وکراہت کا مظہر ہو اس کے لیے مقام عصمت کا ہونا ضروری ہے، تا کہ اس کی رضا وغضب، باری تعالی کی رضا وغضب ہو اور کلمہ ((مَنْ)) کی عمومیت کا تقاضا یہ ہے کہ جو بھی خدا وپیغمبر ﷺ کی اطاعت کے دائرے میں ہے علی - کے فرمان کے آگے سر تسلیم خم کردے۔

دوسری حدیث

((إن رسول الله ﷺ خرج إلی تبوک واستخلف علیا فقال أتخلفنی فی الصبیان والنساء، قال: ألا ترضی أن تکون منی بمنزلة هارون من موسی إلا أنه لیس نبی بعدی))(۳۵)

یہ روایت، اہل سنت کی معتبر کتب صحاح اور مسانید میں ذکر ہوئی ہے۔ اکابر اہل سنت نے اس حدیث کے صحیح ہونے پر اتفاق کو بھی نقل کیا ہے۔ ان کی گفتار کا نمونہ یہ ہے ((هذا حدیث متفق علی صحته رواه الائمة الحفاظ، کأبی عبد الله البخاری فی صحیحه، ومسلم ابن الحجاج فی صحیحه، وأبی داود فی سننه، وأبی عیسی الترمذی فی جامعه، و أبی عبد الرحمان النسائی فی سننه، وابن ماجة القزوینی فی سننه، واتفق الجمیع علی صحته حتی صار ذلک اجماعا منهم، قال الحاکم النیسابوری هذا حدیث دخل فی حدّ التواتر))(۳۶)

اس روایت میں منزلت کے عمومی بیان کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت موسی - کی نسبت جناب ہارون - کو جو مقام حاصل تھا پیغمبر ﷺ کی نسبت حضرت علی - کے لئے بھی وہ مقام ثابت ہے اور استثناء مقام نبوت اس عموم کی تاکید ہے۔

قرآن مجید میں حضرت ہارون - کی نسبت، حضرت موسیٰ - سے اس طرح بیان فرمائی گئی ہے ﴿وَاجْعَلْ لِیْ

وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ۝هٰرُوْنَ اَخِيْ۝اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِيْ۝وَاَشْرِكْهُ فِيْۤ اَمْرِيْ﴾(۳۷)، ﴿وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَ اَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ﴾(۳۸)

اور یہ مقام ومنزلت پانچ امور کا خلاصہ ہے:

۱۔ وزارت: وزیر وہ ہے جو بادشاہ کی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لیتا ہے اور ان امور کو انجام دیتا ہے، اور حضرت علی -کے لئے یہ مقام نہ فقط اس حدیث منزلت، بلکہ اہل سنت کی دیگر معتبر کتب وحدیث وتفاسیر میں بھی ذکر ہوا ہے۔(۳۹)

۲۔ اخوت وبرادری: چونکہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے درمیان نسب کے اعتبار سے برادری تھی، رسول خدا ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ اس منزلت کو عقد اخوت کے ذریعے قائم فرمایا، کہ اس بارے میں شیعہ اور سنی روایات کثرت سے موجود ہیں، جن میں سے ایک روایت کا پیش کر دینا کافی ہے:

عبداللہ بن عمر کا کہنا ہے: مدینہ میں داخل ہونے کے بعد پیغمبر اکرم ﷺ نے اصحاب کے درمیان اخوت وبرادری کا رشتہ برقرار کیا۔ حضرت علی - آبدیدہ ہو کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر گویا ہوئے: یارسول اللہ! آپ نے تمام اصحاب کو اخوت اور برادری کے رشتے میں پرو دیا لیکن مجھے کسی کا بھائی قرار نہیں دیا، آپ ﷺ نے فرمایا((یا علی أنت أخي في الدنیا والآخرۃ))(۴۰)

۳۔ پشت کی مضبوطی: جس طرح حضرت موسیٰ -نے خدا سے ہارون -کے ذریعے اپنی پشت کی مضبوطی کی درخواست کی تھی، اس حدیث کے مطابق آنحضرت ﷺ کی پشت کا مضبوط ہونا حضرت علی -کے ذریعے ثابت ہے اور یہ روایت ان روایات کے علاوہ ہے جو اسی موضوع سے متعلق نقل ہوئی ہیں۔(۴۱)

۴۔ امر میں شراکت: جس طرح ہارون -، موسیٰ -کے امور میں شریک تھے، حدیث کی رو سے اسی طرح نبوت کے علاوہ باقی امور میں حضرت علی -کی شراکت ثابت ہے۔

۵۔ خلافت: جس طرح ہارون -، موسیٰ -کے خلیفہ تھے، اس حدیث کے مطابق حضرت علی -کی بلافصل خلافت بھی ثابت ہے۔

آیا فریقین کے درمیان اس مسلّم نصّ کے ہوتے ہوئے کہ علی ابن ابی طالب -آنحضرت ﷺ کے مددگار، شریک، وزیر، بھائی اور خلیفہ ہیں، کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ آپ -رسول خدا ﷺ کے بلافصل خلیفہ وجانشین ہیں؟!

تیسری حدیث

اس حدیث کو حاکم نیشاپوری نے مستدرک اور ذہبی نے تلخیص میں بریدہ اسلمی سے نقل کیا ہے کہ اس نے کہا: "میں ایک غزوہ میں علی - کے ساتھ یمن گیا اور آپ - کا ایک عمل مجھ پر ناگوار گذرا۔ رسول خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے علی - پر نکتہ چینی شروع کی۔ میں نے دیکھا رسول خدا ﷺ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور آپ ﷺ نے فرمایا: اے بریدہ! آیا میں مومنین کی نسبت ان پر خود ان سے زیادہ اختیار نہیں رکھتا؟ میں نے کہا: ہاں، یا رسول اللہ ﷺ، آپ نے فرمایا: جس جس کا میں مولا ہوں علی - اس کے مولا ہیں۔" (۴۲)

اور یہ وہی غدیر خم والا بیان ہے جسے آنحضرت ﷺ نے بریدہ سے بھی فرمایا ہے۔

اور واقعہ غدیر خم کو اکابر محدثین، مؤرخین اور مفسرین نے اپنے اپنے فن میں موضوع کی مناسبت سے ذکر کیا ہے، بلکہ بزرگان اہل لغت نے اس واقعہ کو لغت کی کتابوں میں بھی نقل کیا ہے، مثال کے طور پر ابن درید نے جمہرۃ اللغۃ میں کہا ہے: ((غدیر معروف وھو الموضع الذی قام فیہ رسول اللّٰہ ﷺ خطیبا یفضّل أمیر المؤمنین علی ابن ابی طالب -)) (۴۳)

اور تاج العروس میں کلمہ ((ولی)) کے ضمن میں کہا کہ: ((الذی یلی علیک أمرک...... ومنہ الحدیث : من کنت مولاہ فعلی مولاہ)) اور بن اثیر، "نہایہ" میں کلمہ ((ولی)) کے ضمن میں کہتا ہے ((وقول عمر لعلی: أصبحت مولی کل مومن، ای ولی کل مومن))

اور حدیث غدیر اہل سنت کے نزدیک صحیح سلسلۂ اسناد کے ساتھ نقل ہوئی ہے، اگر چہ سلسلہ ہائے اسناد اتنے زیادہ ہیں کہ صحت سند کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

حافظ سلیمان بن ابراہیم قندوزی حنفی نے ینابیع المودۃ میں کہا ہے: "مشہور ومعروف مؤرخ جریر طبری نے حدیث غدیر خم کو پچھتر مختلف سلسلۂ اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے اور اس موضوع پر ((الولایۃ)) کے نام سے مستقل کتاب بھی لکھی ہے۔ اسی طرح حدیث غدیر کو ابو العباس احمد بن محمد بن سعید بن عقدہ نے بھی روایت کیا ہے اور اس موضوع پر ((الموالاۃ)) کے نام سے مستقل کتاب لکھی ہے اور اس حدیث کو ایک سو پچاس مختلف سلسلۂ اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے۔"

اور اس کے بعد لکھا ہے کہ: "علامہ علی بن موسی اور ابو حامد غزالی کے استاد امام الحرمین علی ابن محمد ابی المعالی

الجوینی تعجب کرتے ہوئے کہا کرتے تھے: میں نے بغداد میں ایک جلد ساز کے پاس روایات غدیر کے موضوع پر ایک جلد دیکھی کہ اس پر لکھا تھا: یہ پیغمبر اکرم ﷺ کے اس قول ((من کنت مولاہ فعلی مولاہ)) کے سلسلۂ ہائے اسناد کے سلسلے میں اٹھائیسویں جلد ہے۔ انتیسویں جلد اس کے بعد آئے گی۔'' (۴۲)

ابن حجر اپنی کتاب تہذیب التہذیب میں حضرت علی - کے حالات زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے، ابن عبد البر سے اس حدیث کو حضرت علی -، ابو ہریرہ، جابر، براء بن عازب اور زید ابن ارقم کے واسطوں سے نقل کرنے کے بعد کہتا ہے: ''اس حدیث کے ذکر شدہ سلسلۂ ہائے اسناد کے کئی گنا دوسرے سلسلۂ ہائے اسناد، ابن جریر طبری نے اپنی کتاب میں جمع کیے ہیں۔ اور ابو العباس بن عقدہ نے سلسلۂ اسناد کو جمع کرنے میں خاص توجہ کی ہے اور حدیث کو ستر یا اس سے زیادہ اصحاب سے نقل کیا ہے۔''

امیر المومنین - کی ولایت اور خلافت بلا فصل پر اس حدیث کی دلالت واضح و روشن ہے۔

اگر چہ لفظ ((مولیٰ)) متعدد معنی میں استعمال ہوا ہے، لیکن جن قرائن سے یہ بات ثابت ہے کہ اس حدیث میں مولی سے ولایت امر مراد ہے ان میں سے بعض کو ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

۱۔ اس مطلب کو بیان کرنے سے پہلے حضرت رسول خدا ﷺ نے اپنی رحلت کی خبر دی اور قرآن و عترت کی پیروی کی تاکید فرمائی اور فرمایا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں ہوں گے۔ اس کے بعد اس عنوان سے کہ جس جس کا میں مولا ہوں علی - اس کے مولا ہیں، حضرت علی - کا تعارف کروانا اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے آنحضرت ﷺ کا مقصد ایسے شخص کی پہچان کروانا ہے کہ جس شخص اور قرآن سے تمسک رکھتے ہوئے امت، آپ کے بعد ضلالت و گمراہی سے نجات پا سکتی ہے۔

۲۔ اس عظیم اجتماع کو حج سے واپسی کے دوران فقط یہ بتانے کے لئے کہ علی - اہل ایمان کا دوست، اور مددگار ہے، تپتے ہوئے صحراء میں روکنا اور پالان شتر سے منبر بنانا، آپ ﷺ کے مقام خاتمیت کے ساتھ تناسب نہیں رکھتا، بلکہ یہ خصوصیات اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ کوئی اہم اعلان کرنا مقصود تھا اور لفظ مولا سے ولایت امر ہی مراد ہو سکتی ہے۔

۳۔ واحدی نے اسباب النزول میں ابی سعید خدری سے نقل کیا ہے کہ ﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (۴۳) غدیر خم کے روز، علی

بن ابی طالب - کی شان میں نازل ہوئی۔(۴۷)

آیت کریمہ کے شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مطلب کی تبلیغ کے لئے رسول خدا ﷺ مامور تھے اس کی دو خصوصیات تھیں:

اول۔ مرتبے کے اعتبار سے اس کی تبلیغ اتنی زیادہ اہمیت کی حامل ہے کہ خداوند متعال فرما رہا ہے: "اگر اسے انجام نہ دیا تو تبلیغ رسالت ہی کو انجام نہ دیا۔"

دوم۔ یہ کہ اس تبلیغ میں خدا تمہیں بچانے والا ہے، یعنی معلوم ہوتا ہے کہ اس اعلان کے بعد منافقین کی سازشوں کا سلسلہ چل پڑے گا جو آپ ﷺ کے ظہور اور توسیع حکومت کے بارے میں اہل کتاب سے سن کر اس حکومت کو حاصل کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ سے آملے تھے، لہذا ((مولیٰ)) کے معنی، ولایت امر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتے۔

۴۔ خطیب بغدادی نے ابوہریرہ سے روایت نقل کی ہے کہ: "جو اٹھارہ ذی الحجہ کو روزہ رکھے اس کے لئے ساٹھ ماہ کے روزے لکھے جاتے ہیں اور یہ غدیر خم کا دن ہے، جب نبی اکرم ﷺ نے علی بن ابی طالب - کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: آیا میں مومنین کا مولا ہوں؟ سب نے کہا: ہاں، یا رسول اللہ ﷺ، تو فرمایا: جس جس کا میں مولا ہوں علی - بھی اس کے مولا ہیں۔

یہ سن کر عمر بن خطاب نے کہا: بخ بخ یا ابن ابی طالب، آپ میرے اور تمام مسلمانوں کے مولا قرار پائے، پھر خدا نے یہ آیت نازل فرمائی ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾(۴۸)

وہ چیز جس کے ذریعے اکمال دین و اتمام نعمت خدا ہے اور جس کی وجہ سے دین اسلام خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے، وہ احکام خدا کے معلم اور انہیں عملی جامہ پہنانے والے کا تعین ہے۔

۵۔ نور الابصار میں شبلنجی نے لکھا ہے(۴۹): "امام ابو اسحاق ثعلبی اپنی تفسیر میں نقل کرتے ہیں کہ: سفیان بن عیینہ سے پوچھا گیا کہ آیت ﴿سَاَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ﴾(۵۰) کس کی شان میں نازل ہوئی ہے؟

اس نے کہا: مجھ سے تم نے ایسے مسئلے کے بارے میں سوال کیا ہے جسے تم سے پہلے کسی اور نے نہیں پوچھا۔ میرے لئے میرے والد نے جعفر بن محمد اور انہوں نے اپنے اجداد سے حدیث بیان کی ہے کہ غدیر خم کے مقام پر جب رسول خدا ﷺ نے لوگوں کو بلایا اور سب جمع ہو چکے تو آپ ﷺ نے علی - کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: ((من کنت

مولاہ فعلی مولاہ))، اس طرح یہ بات شہروں میں مشہور ہونے لگی اور جب یہ خبر حارث بن نعمان فہری تک پہنچی تو وہ رسول خدا ﷺ کے پاس آیا اور کہا: اے محمد ﷺ! تو نے حکم دیا تھا کہ خدا کی وحدانیت اور تیری رسالت کا اقرار کریں، سو ہم نے اقرار کیا، تو نے حکم دیا کہ پانچ وقت کی نمازیں پڑھیں، ہم نے قبول کیا، زکات دینے کو کہا ہم نے قبول کیا، حکم دیا کہ رمضان کے روزے رکھیں ہم نے قبول کیا، حج کرنے کا حکم دیا، ہم نے یہ بھی مان لیا، لیکن تم اس پر بھی راضی نہ ہوئے اور اپنے چچا زاد بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اسے ہم پر فضیلت دینا چاہی اور کہا ((من کنت مولاہ فعلی مولاہ))، آیا یہ تمہارا فیصلہ ہے یا خداوند عزوجل کا حکم ہے؟

پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: والذی لا إله إلا هو، یقینا یہ خداوند عزوجل کا حکم ہے۔

حارث بن نعمان سوار ہونے کے لئے اپنی سواری کی طرف بڑھا اور کہا: بارالہا! جو کچھ محمد ﷺ کہہ رہا ہے اگر یہ سچ ہے تو ہم پر آسمان سے سنگ یا دردناک عذاب نازل فرما۔

ابھی وہ اپنی سواری تک نہ پہنچا تھا کہ خداوند عزوجل نے پتھر نازل فرمایا جو اس کے سر پر آیا اور دوسری طرف سے نکل گیا اور وہ وہیں مرگیا۔ اس موقع پر خداوند عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی ﴿سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ ۝ لِلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ ۝ مِنَ اللَّهِ ذِي الْمَعَارِجِ﴾(۵۱)

اس میں کسی قسم کے شک و تردید کی گنجائش نہیں کہ علی - کے بارے میں، لوگوں نے رسول خدا ﷺ سے فضائل سن رکھے تھے۔ وہ بات جو حارث بن نعمان جیسے افراد کے لئے نئی، شہروں میں منتشر شدہ اور نا قابل یقین فضیلت تھی، وہ رسول خدا ﷺ کی جانب سے، علی - کے لئے، مولی اور ولی ہونے کا اعلان تھا، جو اس جیسے افراد برداشت نہ کر سکتے تھے، نہ یہ کہ مولی کے کوئی دوسرے معنی ہوں۔

۶۔ احمد بن حنبل نے مسند میں(۵۲)، فخر رازی نے تفسیر میں(۵۳)، خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں(۵۴) اور ان کے علاوہ دوسروں نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے، لیکن ہم فقط مسند احمد کی روایت پر اکتفا کرتے ہیں:

احمد نے براء بن عازب سے نقل کیا ہے کہ اس نے کہا: ہم رسول خدا ﷺ کے ساتھ ہمسفر تھے۔ غدیر خم کے مقام پر رکے، نماز جماعت کے لئے بلایا گیا، رسول خدا ﷺ کے لئے دو درختوں کے نیچے جھاڑو دی گئی، آپ ﷺ نے نماز ظہر ادا کی اور علی - کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ میں مومنین سے ان کی اپنی نسبت اولی ہوں؟ سب نے کہا: ہاں، فرمایا: کیا تم نہیں جانتے ہو کہ میں ہر مومن سے خود اس کی نسبت اولی ہوں؟ سب نے

کہا: ہاں، پھر آپ نے علی - کا ہاتھ بلند کر کے فرمایا ((من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللّٰھم وال من والاہ وعاد من عاداہ))۔ براء بن عازب کہتا ہے: اس کے بعد عمر نے علی - کے ساتھ ملاقات کی اور آپ سے کہا ((ھنیئاً یا ابن ابی طالب، اصبحت وامسیت مولی کل مومن ومومنۃ))۔

عمر جیسے شخص سے اس طرح کی مبارک باد، ایک ایسی چیز کے لئے جس میں حضرت علی - کے ساتھ دوسرے مومنین بھی شریک ہوں، دوستی کے معنی میں نہیں، بلکہ بلا شبہ کے مبارک باد کا یہ انداز کسی خاص فضیلت کے لئے ہی ہوسکتا ہے اور وہ فضیلت زعامت وامت ومنصب خلافت رسول خدا ﷺ کے سوا کچھ نہیں۔

۷۔ اکابر اہل سنت کی ایک جماعت مثلاً ابن حجر عسقلانی نے الاصابۃ میں (۵۵)، ابن اثیر نے اسد الغابۃ میں (۵۶) اور دیگر علماء نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ ہم ابن اثیر کی روایت پر اکتفا کرتے ہیں:

"ابو اسحاق کہتا ہے: میرے لئے اس حدیث کو بیان کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ میں بیان نہیں کرسکتا، کہ علی - نے رحبہ کے مقام پر رسول خدا ﷺ کے اس قول ((من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللّٰھم وال من والاہ وعاد من عاداہ)) کو سننے والوں کو طلب کیا، ایک گروہ نے اٹھ کر گواہی دی کہ انہوں نے اسے رسول خدا ﷺ سے سنا ہے، جب کہ کچھ لوگوں نے اسے چھپایا اور جنہوں نے وہاں گواہی نہ دی تھی، اندھے ہوئے اور آفت میں گرفتار ہونے سے پہلے نہ مرے۔"

حضرت علی - کا اس روایت کے ذریعے اتمام حجت کرنا اور گواہی کے لئے لوگوں کو طلب کرنا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ حدیث میں، منصب ولایت وامر اور زعامت وامت ہی مراد ہے۔

۸۔ ولایت علی ابن ابی طالب - کو بیان کرنے سے پہلے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "خدا میرا مولا ہے اور میں ہر مومن کا مولا ہوں۔" خدا آپ ﷺ کا مولا ہے یعنی خدا کے علاوہ کسی اور کو آنحضرت ﷺ پر ولایت حاصل نہیں اور جس طرح سے خدا آپ ﷺ کا مولا ہے، آپ بھی اسی طرح ہر مومن کے مولا ہیں اور اہل ایمان پر جو ولایت آنحضرت ﷺ کو حاصل ہے حضرت علی - کو بھی وہی ولایت حاصل ہے۔ اور واضح وروشن ہے کہ اس ولایت سے رسول خدا ﷺ کی خلافت مراد ہے۔

۹۔ حضرت علی - کا اس طرح تعارف کرانے سے پہلے آپ ﷺ نے اس جملے کے ذریعے اعتراف واقرار لیا کہ ((الست اولی بکم)) سب نے کہا: ہاں یارسول اللہ، اور یہ وہی اولویت ہے جسے خداوند متعال نے قرآن میں

فرمایا ہے ﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلیٰ بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾(۵۷)اور اس کے بعد یہ فرمایا: "جس جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں"، اور جملۂ ((ألست أولی بکم)) کو پہلے ذکر فرما کر کلمۂ ولی کے بارے میں تمام شبہات کو برطرف کر دیا، اور اس طرح یہ مطلب واضح کر دیا کہ مومنین کی نسبت جو اولیت آپ ﷺ کو حاصل ہے، حضرت علی - کے لئے بھی وہی اولویت ثابت ہے۔

چوتھی حدیث

رسول خدا ﷺ نے آپ - سے فرمایا: ((انت منی و انا منک))(۵۸) اس حدیث کو امام بخاری اور دوسرے تمام بزرگ محدثینِ اہل سنت نے ذکر کیا ہے اور ایک دوسری حدیث جس کے صحیح ہونے کا علم حدیث کے تمام اکابر ائمہ اعتراف کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ((علی مع القرآن والقرآن مع علیّ لن یفترقا حتی یردا علی الحوض))(۵۹)

یہ دو حدیثیں حضرت علی - کی بلافصل خلافت پر واضح دلالت کرتی ہیں، اس لئے کہ عالم امکان میں پیغمبر اکرم سے بڑھ کر کوئی نہیں، کیونکہ پروردگار عالم کی عام رحمت رحمانیہ اور خاص رحمت رحیمیہ کے نور سے تمام عالمین منور ہیں اور ان دونوں رحمتوں کا مظہر وہ کامل انسان ہے جس کے بارے میں قرآن فرماتا ہے ﴿وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلاَّ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ﴾(۶۰)، اسی طرح جیسے قرآن سے بڑھ کر کتبِ الٰہی میں کوئی دوسری کتاب نہیں ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتَاباً مُّتَشَابِهاً﴾(۶۱)

اور حضرت علی - کا ان دو کے ہمراہ ہونا اور ان دو کا حضرت علی - کے ہمراہ ہونا، اس مطلب کی نشاندہی کرتا ہے کہ جو کمالات خاتم النبیین ﷺ کے وجود مبارک میں جمع ہیں حضرت علی - میں بھی وہ کمالات پائے جاتے ہیں اور آسمانی کتابوں کے تمام علوم جو قرآن مجید میں ذکر ہوئے ہیں وہ تمام کے تمام علوم بیان علی - میں سمٹ آئے ہیں﴿اَفَمَنْ یَّهْدِیْ اِلَی الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لاَّ یَهِدِّیْ اِلاَّ اَنْ یُّهْدٰی فَمَا لَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ﴾(۶۲)

پانچویں حدیث

وہ حدیث ہے جس کی سند کے صحیح ہونے کا محدثین اور رجال اہل سنت نے اعتراف کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کچھ لوگ ابن عباس کے پاس آئے جو امیر المومنین - کے بارے میں ناروا الفاظ استعمال کر رہے تھے، تو ابن

عباس نے کہا: ایسے شخص کے بارے میں ناروا کہہ رہے ہیں جو ایسی دس فضیلتوں کا مالک ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور کے لئے نہیں ہیں۔

۱۔ جنگ خیبر میں (جب دوسرے گئے اور عاجز ہو کر پلٹ آئے تو) رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ایسے شخص کو بھیجوں گا جسے خدا نے ہرگز ذلیل و رسوا نہیں کیا وہ خدا و رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے اور خدا اور رسول ﷺ اس سے محبت کرتے ہیں۔

سب گردنیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے کہ وہ کون ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: علی - کہاں ہیں؟ آپ دکھتی آنکھوں کے ساتھ آئے، رسول خدا سے شفا پانے کے بعد، آنحضرت ﷺ نے علم کو تین مرتبہ لہرانے کے بعد علم علی - کو دیا۔

۲۔ فلاں کو رسول خدا ﷺ نے سورۂ توبہ کے ساتھ مشرکین کی جانب روانہ کیا، پھر اس کے پیچھے علی - کو بھیجا اور اس سے سورہ لے کر فرمایا: یہ سورہ اس فرد کے علاوہ کوئی نہیں لے جاسکتا جو مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔

۳۔ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کون ہے جو دنیا او رآخرت میں میرا ولی ہو؟ کسی نے قبول نہ کیا، علی - سے فرمایا: دنیا و آخرت میں تم میرے ولی ہو۔

۴۔ خدیجہ کے بعد علی - سب سے پہلے ایمان لائے۔

۵۔ رسول خدا ﷺ نے چار افراد علی و فاطمہ و حسن و حسین علیہم السلام پر اپنی چادر اوڑھا کر فرمایا: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾

۶۔ علی - وہ ہے جس نے اپنی جان کو رسول خدا ﷺ پر فدا کیا، آنحضرت ﷺ کا لباس پہن کر رات بھر آپ کے بستر پر سوئے اور صبح ہونے تک مشرکین آپ - کو پیغمبر سمجھ کر پتھر برساتے رہے۔

۷۔ غزوہ تبوک میں علی - کو اپنا نائب بنا کر مدینہ میں رہنے کو کہا۔ جب علی - رسول خدا ﷺ کے فراق کی وجہ سے آبدیدہ ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: آیا تم راضی نہیں ہو کہ تمہاری نسبت مجھ سے وہی ہو، جو ہارون کو موسیٰ سے تھی، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہے۔ یقیناً میرا جانا اسی وقت سزاوار ہے جب تم میرے خلیفہ ہو۔

۸۔ رسول خدا ﷺ نے علی - سے فرمایا: میرے بعد تم ہر مومن و مومنہ کے ولی ہو۔

۹۔ رسول خدا ﷺ نے علی - کے گھر کے دروازے کے علاوہ مسجد نبوی میں کھلنے والے تمام دروازوں کو بند کیا۔

۱۰۔ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ((من کنت مولاہ فعلی مولاہ))(۶۳)

آیا پیغمبر ﷺ کی اس نص کے باوجود کہ تمام اصحاب کے ہوتے ہوئے فتح کا علم علی ؑ کو دیا، صرف اس کو خدا اور رسول ﷺ کا حبیب و محبوب کہا، خدا کے پیغام کو دوسروں سے لے کر اسے دیا کہ ضروری ہے کہ علی ؑ مبلغ کلام خدا ہو، کیونکہ وہ مجھ سے اور میں اس سے ہوں، اسی طرح آنحضرت ﷺ کی یہ تصریح کہ میرا جانا اس وقت تک سزاوار نہیں جب تک کہ تم میرے خلیفہ نہ ہو، علی ؑ کی ولایت مطلقہ وکلیہ کا بیان ((انت ولی کل مومن بعدی ومومنۃ)) اور ((من کنت مولاہ فعلی مولاہ))۔ کیا اس سنت صحیحہ کے باوجود علی ؑ کی خلافت بلافصل میں اہل نظر وانصاف کے لئے کسی قسم کے شک وتردید کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟!

اس مختصر مقدمے میں اس موضوع سے متعلق آیات واحادیث کی گنجائش نہیں، جیسا کہ پانچویں صدی ہجری کے نامور افراد میں سے حسکانی حنفی نے مجاہد جیسے بزرگ تابعین اور اعلام مفسرین سے نقل کیا ہے کہ علی ؑ کے لئے ستر فضیلتیں ایسی ہیں جن میں سے کوئی ایک بھی، پیغمبر اکرم ﷺ کی کسی صحابی کو حاصل نہیں ہے، جب کہ اصحاب پیغمبرؐ کے تمام فضائل میں علی ؑ ان کے شریک ہیں۔(۶۴)

اور ابن عباس سے روایت کی ہے کہ قرآن کی ﴿اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ جیسی تمام آیات کے مصادیق میں علی ؑ سب کے سید وسردار ہیں اور اصحاب محمد ﷺ میں سے کوئی ایسا نہیں جس پر خدا نے ناراضگی کا اظہار نہ کیا ہو، جب کہ علی ؑ کو اچھائی کے علاوہ یاد نہیں کیا۔(۶۵)

علی ؑ میں اٹھارہ فضیلتیں ایسی ہیں کہ اس امت کے کسی فرد کے پاس اس جیسی ایک فضیلت بھی ہو تو اس کے ذریعے نجات یافتہ ہوجائے اور بارہ فضیلتیں ایسی ہیں جو اس امت میں سے کسی کے پاس بھی نہیں ہیں۔(۶۶)

ابن ابی الحدید کہتا ہے: ''ہمارے استاد ابوالہذیل سے پوچھا گیا: خدا کے نزدیک علی ؑ کا مقام زیادہ بلند ہے یا ابوبکر کا؟''

جواب دیا: ''خدا کی قسم! خندق کے دن علی ؑ کا عمرو سے مقابلہ، تمام مہاجرین وانصار کے اعمال واطاعت کے برابر ہے، تم تنہا ابوبکر کی بات کرتے ہو۔''(۶۷)

حنبلی مذہب کے امام، احمد کا کہنا ہے: ((ماجاء لأحد من أصحاب رسول اللّٰہ من الفضائل ماجاء لعلی بن أبی طالب))(۶۸)

لغت وادب کے ماہر اور علم عروض کے بانی، خلیل بن احمد کے بقول: ''کسی کے بھی فضائل یا دوستوں کے ذریعہ نشر ہوتے ہیں یا دشمنوں کے ذریعے۔ علی بن ابی طالب - کے فضائل کو دوستوں نے خوف اور دشمنوں نے حسد کی وجہ سے چھپایا، اس کے باوجود آپ کے فضائل اس طرح سے نشر ہو گئے۔''

اگر دشمنوں کا حسد اور دوستوں کو خوف نہ ہوتا اور حکومت بنوامیہ و بنی عباس کی اندھیری راتوں کی تاریکیاں اس سورج پر پردے نہ ڈالتیں تو علی - کی فضیلتوں کا نور آفاق کو کس طرح روشن و منور کر دیتا؟!

اس مقدس گفتگو کو آپ - کی شان میں دو آیتوں کے ذکر پر ختم کرتے ہیں:

ا۔ ﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلاَةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكوٰةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ﴾ (۶۹)

اکابر علمائے اہل سنت نے، اس آیت کے امیر المومنین - کی شان میں نازل ہونے کا اعتراف کیا ہے، فخر رازی کی نقل کردہ حدیث کو بطور خلاصہ ملاحظہ فرمائیے:

''ابو ذر کہتے ہیں: میں نے ظہر کی نماز رسول خدا ﷺ کے ساتھ ادا کی، ایک سائل نے مسجد میں آکر بھیک مانگی۔ کسی نے اسے کچھ نہ دیا، علی - رکوع کی حالت میں تھے، آپ - نے اس انگلی سے، جس میں انگوٹھی تھی، سائل کو اشارہ کیا، سائل نے آپ کے ہاتھ سے وہ انگوٹھی لے لی۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے خدا سے التجا کی اور فرمایا: خدایا! میرے بھائی موسیٰ پیغمبر نے تجھ سے سوال کیا اور کہا: ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ﴾ تو نے اس پر نازل کیا ﴿سَنَشُدُّ عَضُدَکَ بِأَخِيْکَ وَنَجْعَلُ لَکُمَا سُلْطَاناً﴾، بارالٰہا! میں محمد تیرا بندہ ہوں، مجھے شرح صدر عطا فرما، میرا کام آسان فرما اور میرے اہل سے علی کو میرا وزیر قرار دے۔ اس کے ذریعے میری پشت کو مضبوط فرما۔ ابوذر کہتے ہیں: خدا کی قسم! ابھی رسول خدا ﷺ کے کلمات ختم نہ ہوئے تھے کہ جبرئیل اس آیت کے ساتھ نازل ہوئے۔'' (۷۰)

رسول خدا ﷺ کی دعا کے بعد اس آیت کا نازل ہونا آپ ﷺ کی دعا کا اثر ہے، کہ جو مقام ہارون کو موسیٰ کی نسبت حاصل تھا وہی مقام و مرتبہ علی - کو رسول خدا ﷺ کی نسبت عطا کیا گیا۔

اور اس آیت میں حرف عطف کی بنا پر جو الٰہی ولایت، رسول خدا ﷺ کے لیے ہے، علی - کے لئے بھی ثابت ہے۔

اور لفظ ((إنما)) انحصار پر دلالت کی وجہ سے اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس آیت میں خدا، رسول اور علی کی

ولایت ایسی ولایت ہے جو صرف ان تین میں منحصر ہے اور" ولی" کے معانی میں سے اس کا معنی، ولایت امر کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ﴿فَمَنْ حَاجَّکَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآئَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَائَنَا وَاَبْنَائَکُمْ وَنِسَائَنَا وَنِسَائَکُمْ وَاَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْکَاذِبِيْنَ﴾(۱)

اس آیت کریمہ میں اہل نظر کے لئے چند نکات ہیں، جن میں سے تین نکات کی طرف، طویل تشریح سے گریز کرتے ہوئے اشارہ کرتے ہیں۔

رسول خدا ﷺ کا مباہلہ کے لئے دعوت دینا آپ ﷺ کی رسالت کی دلیل و برہان ہے، جب کہ نصاریٰ کا مباہلہ سے گریز نصرانیت کے بطلان اور آئین محمدی کی حقانیت کا اعتراف ہے۔ لفظ ((أنفسنا)) امیر المومنین علی کی خلافت بلافصل کی دلیل ہے، کیونکہ نص قرآن کے مطابق نفسِ تنزیلی کے ہوتے ہوئے، جو درحقیقت وجودِ ختمی مرتبت ﷺ کا تسلسل ہے، کسی اور کی جانشینی معقول ہی نہیں۔

تمام جید مفسرین ومحدثین کا جس بات پر اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ ((أبنائنا)) سے مراد حسن وحسین علیہما السلام، ((نسائنا)) سے مراد فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا اور ((أنفسنا)) سے مراد علی ابن ابی طالب - ہیں۔ اس سلسلے میں ایک حدیث کا مضمون بطور خلاصہ ملاحظہ ہو، جسے فخر رازی نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے:

"رسول خدا ﷺ نے جب نجران کے نصاریٰ کے سامنے اپنے دلائل پیش کر دیئے اور وہ اپنی جہالت پر قائم رہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: "خدا نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ اگر تم دلیل نہیں مانتے ہو تو میں تمہارے ساتھ مباہلہ کروں۔" یہ سن کر انہوں نے کہا: "اے ابوالقاسم! ہم جا رہے ہیں، اپنے امور میں سوچ بچار کے بعد دوبارہ لوٹ کر آئیں گے۔" جب وہ پلٹ کر گئے تو انہوں نے اپنے صاحب رائے، عاقب سے پوچھا: "اے عبدالمسیح! تیرا کیا مشورہ ہے؟" تو اس نے کہا: اے نصاریٰ تم جان چکے ہو کہ محمد خدا کے فرستادہ نبی ہیں اور تمہارے لئے، عیسیٰ کے بارے میں کلامِ حق لائے ہیں۔ خدا کی قسم! کسی ایسی قوم نے پیغمبر کے ساتھ مباہلہ نہیں جس کے بڑے زندہ بچے ہوں اور چھوٹے پرورش پا سکے ہوں، اگر تم نے اس کام کو انجام دیا تو جڑ سے اکھڑ جاؤ گے۔ اگر اپنے دین پر باقی رہنا ہی چاہتے ہو تو اس سے رخصت ہو کر اپنے شہروں کو لوٹ جاؤ۔"

ادھر رسول خدا اس حالت میں باہر آئے کہ حسین کو آغوش میں لئے ہیں، حسن کا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں، فاطمہ

كلمة لم أسمعها، فقال أبي:إنه قال: كلهم من قريش))(١)

٢ـ صحیح مسلم:((عن جابر بن سمرة قال:دخلت مع أبي على النبي ﷺ فسمعته يقول:إن هذا الأمر لا ينقضي حتى يمضي فيهم اثنا عشر خليفة، قال:ثم تكلم بكلام خفي علي، قال:فقلت لأبي:ماقال؟ قال: كلهم من قريش))(٢)

٣ـ صحیح مسلم:((عن جابر بن سمرة قال:سمعت النبي ﷺ يقول:لايزال أمرالناس ماضيا ما وليهم اثنا عشر رجلا، ثم تكلم النبي ﷺ بكلمة خفيت علي، فسئلت أبي:ماذا قال رسول اللّٰه؟ فقال: كلهم من قريش))(٣)

٤ـ صحیح ابن حبان :((سمعت رسول الله ﷺ يقول:يكون بعدى اثنا عشر خليفة كلهم من قريش))(٤)

٥ـ جامع ترمذی:((يكون من بعدى إثنا عشر أميرا، قال :ثم تكلم بشئ لم أفهمه، فسألت الذى يليني، فقال: قال: كلهم من قريش))(٥)

٦ـ مسند احمد بن حنبل:((يكون بعدى إثنا عشر خليفة، كلهم من قريش))(٦)

٧ـ مسند احمد بن حنبل:((يكون بعدى إثنا عشر أميرا، ثم لا أدرى ماقال بعد ذلک، فسألت القوم كلهم، فقالوا: قال: كلهم من قريش))(٧)

٨ـ مسند احمد بن حنبل :((يكون بعدى إثنا عشر أميرا، فتكلم فخفي عليّ، فسألت الذى يليني أو إلى جنبي، فقال: كلهم من قريش))(٨)

٩ـ مسند احمد بن حنبل :((يكون بعدى إثنا عشر أميرا،قال:ثم تكلم فخفي عليّ ما قال، قال:فسألت بعض القوم أو الذى يليني ماقال؟ قال: كلهم من قريش))(٩)

١٠ـ مسند ابن الجعد:((يكون بعدي اثنا عشر اميرا، غيرأن حصينًا قال فى حديثه : ثم تكلم بشئ لم أفهمه، وقال بعضهم: فسألتُ أبي، وقال بعضهم: فسألت القوم فقال: كلهم من قريش))(١٠)

١١ـ مسند ابي يعلى:((يقول:لا يزال الدين قائما حتى تقوم الساعة ويكون عليكم إثنا عشر خليفة كلهم من قريش))(١١)

۱۲۔ مسند احمد بن حنبل :((عن جابر بن سمرة قال: خطبنا رسول اللهﷺ بعرفات فقال: لا يزال هذا الأمر عزيزا منيعا ظاهرا على من ناواه حتى يملك اثنا عشر كلهم، قال: فلم أفهم ما بعد، قال: فقلت لأبي ما قال بعد ما قال: كلهم، قال: كلهم من قريش))(۱۲)

۱۳۔ مستدرک حاکم :((عن مسروق قال: كنا جلوسا ليلة عند عبد الله يقرئنا القرآن فسأله رجل فقال: يا أبا عبدالرحمن هل سألتم رسول الله ﷺ كم يملك هذه الأمة من خليفة؟ فقال عبد الله: ماسئلني هذا أحد منذ قدمت العراق قبلك، قال: سئلناه، فقال: اثنا عشر عدة نقباء بني اسرائيل))(۱۳)

اس موضوع سے متعلق روایات صرف ان مذکورہ کتب میں ذکر نہیں ہوئیں بلکہ ان کتب میں بھی ذکر شدہ روایات سے کہیں زیادہ روایات ذکر ہوئی ہیں، لیکن اختصار کی وجہ سے اس تعداد پر اکتفا کیا گیا ہے۔(۱۴)

بارہ اماموں کے بارے میں رسول خدا ﷺ سے منقول نصوص جنہیں عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، سلمان فارسی، ابی سعید خدری، ابی ذر غفاری، جابر بن سمرۃ، جابر بن عبداللہ، انس بن مالک، زید بن ثابت، زید بن ارقم، ابی عمامہ، واصلۃ بن اسقع، ابی ایوب انصاری، عمار بن یاسر، حذیفہ بن اسید، عمران بن حصین، سعد بن مالک، حذیفہ بن یمان اور ابی قتادہ انصاری جیسے بزرگ وجلیل القدر اصحاب کے علاوہ دوسرے بزرگان نے بھی روایت کیا ہے جو اختصار کے پیش نظر جن کے ذکر سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

اس روایت میں بعض خصوصیات کا تذکرہ ہے جیسے:

۱۔ خلفاء کا فقط بارہ افراد پر مشتمل ہونا۔

۲۔ ان بارہ افراد کی خلافت کا قیامت تک باقی رہنا۔

۳۔ دین کی عزت واستقامت کا ان سے وابستہ ہونا۔

۴۔ علمی وعملی اعتبار سے ان کے ذریعے دین کا قائم ہونا، کیونکہ قیام دین ان خلفاء کے ذریعے ہی ممکن ہے جو علمی اعتبار سے معارف وحقائق دین کو بیان کریں اور عملی اعتبار سے حق وقوانین عادلہ کو جاری کرنے والے ہوں اور ان دو اہم اجزاء کا میسر ہونا ان شرائط کے بغیر ناممکن ہے، جس کے شیعہ، بارہ اماموں کے بارے میں قائل ہیں۔

۵۔ نقباء بنی اسرائیل کی نظیر قرار دینے سے کشف ہوتا ہے کہ منصوب من اللہ ہیں، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے

کیا گیا ہے ﴿وَبَعَثْنَا مِنهُمُ اِثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا﴾(۱۵)

۶۔ ان سب کا قریش سے ہونا۔

آیا یہ خصوصیات رکھنے والے خلفاء طریقہ حقہ اثنا عشری اور بارہ اماموں کے علاوہ کہیں اور قابل انطباق ہیں؟!

کیا یزید اور یزید جیسوں کی خلافت میں، نقباء بنی اسرائیل جیسی اسلام کی عزت، امت کی نگہداشت اور ویسی حکومت میسر آسکتی ہے؟!

اور اہل سنت کے بعض محققین نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ حدیث نہ تو پیغمبر کے بعد کے خلفاء پر قابل انطباق ہے، اس لئے کہ ان کی تعداد بارہ سے کم ہے، نہ سلاطین نبی امیہ پر حمل کی جا سکتی ہے، ان کے مظالم اور تعداد میں بارہ سے زیادہ ہونے کی وجہ سے، اور نہ ہی ملوک بنی عباس پر قابلِ تطبیق ہے، کیونکہ ان کی تعداد بھی بارہ سے زیادہ ہے اور انہوں نے بھی آیت ﴿قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبىٰ﴾(۱۶) کا حق ادا نہیں کیا۔ یہ احادیث آنحضرت ﷺ کی آل وعترت کے علاوہ کسی اور مقام پر منطبق نہیں ہو سکتیں کیونکہ وہ اپنے اپنے زمانے میں باقی تمام بنی نوع انسان سے اعلم، اجل، اورع اور اتقی ہونے کے ساتھ ساتھ حسب ونسب کے اعتبار سے بھی افضل واعلیٰ اور دوسروں کی نسبت خدا کے نزدیک زیادہ صاحب اکرام تھے۔ اہل علم وتحقیق اور اہل کشف وتوفیق نے ان ہستیوں کو اسی مقام ومنزلت پر فائز پایا ہے۔(۱۷)

اور سدی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے: ''چونکہ سارہ کو ہاجرہ کے ساتھ رہنا ناپسند تھا خداوند کریم نے حضرت ابراہیم - پر وحی نازل کی اور فرمایا: اسماعیل اور ان کی والدہ کو یہاں سے ''نبی تہامی کے گھر'' یعنی مکہ لے جاؤ، میں تمہاری نسل کو پھیلاؤں گا اور میرے بارے میں کفر کرنے والوں پر انہیں قدرت عطا کروں گا اور اس کی نسل سے بارہ کو عظیم قرار دوں گا۔''(۱۸)

اور یہ بات تورات میں سفر تکوین کے سترہویں باب میں موجود اس عبارت کے موافق ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیم سے فرمایا: ''میں نے تمہاری دعا کو اسماعیل کے بارے میں بطور خاص قبول کیا، اب اپنی برکت سے اسے صاحب اولاد بناؤں گا اور اس کو بہت کثرت عطا کروں گا، اس سے بارہ سردار بنیں گے اور اس سے عظیم امت پیدا کروں گا۔''

اور بارہ ائمہ کی امامت، صحیح روایات اور معصوم سے مروی متواتر نصوص جو سند کی بحث سے بے نیاز ہوتی ہیں،

کے ذریعہ ثابت ہے۔ ہم اس مقدمے میں ''حدیثِ لوح'' پر اکتفا کرتے ہیں، جسے متعدد اسناد کے ساتھ، جن میں سے بعض معتبر ہیں، بزرگ محدثین نے نقل کیا ہے۔ ہم ان میں سے دو روایات کو یہاں ذکر کرتے ہیں:

پہلی روایت

یہ وہ روایت ہے جسے شیخ صدوقؒ نے پانچویں امام - اور انہوں نے جابر بن عبداللہ انصاری سے نقل کیا کہ جابر بن عبداللہ انصاری نے کہا: میں حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کے سامنے ایک لوح رکھی تھی جس پر اوصیاء کے نام تھے۔ میں نے انہیں گنا تو بارہ تھے جن میں سے آخری قائم تھے، تین محمد اور چار علی تھے۔ (۱۹)

دوسری روایت

یہ حدیث اخبار غیبی پر مشتمل ہے اور خود اس کا متن اس کے مقام عصمت سے صادر ہونے پر گواہ ہے۔ اسے شیعہ اکابر محدثین جیسے شیخ مفید، شیخ کلینی، شیخ صدوق اور شیخ طوسی اعلی اللہ مقامہم نے عبدالرحمٰن بن سالم، انھوں نے ابی بصیر اور انھوں نے چھٹے امام - سے نقل کیا ہے اور مضمون روایت تقریباً یہ ہے کہ:

''میرے والد گرامی نے جابر بن عبداللہ انصاری سے فرمایا: ''مجھے تم سے ایک کام ہے، تمہارے لئے کس وقت آسانی ہے کہ تم سے اکیلے میں ملوں اور اس بارے میں سوال کروں؟''

جابر نے کہا: ''جس وقت آپ پسند فرمائیں۔''

پھر ایک دن جابر سے تنہائی میں ملاقات کی اور فرمایا: ''اے جابر! جو لوح تم نے میری والدہ گرامی حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ دیکھی تھی اور لوح پر لکھے ہوئے کے بارے میں جو میری مادر گرامی نے بتایا تھا، مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔''

جابر نے کہا: ''خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ رسول خدا ﷺ کی زندگی میں آپ کی والدہ گرامی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے نہیں ولادتِ امام حسین - کی مبارک باد دی۔ ان کے ہاتھوں میں سبز رنگ کی ایسی لوح دیکھی کہ جس کی بارے میں مجھے گمان ہوا کہ زمرد کی ہے اور اس میں سورج کے رنگ کی مانند سفید لکھائی

دیکھی، ان سے کہا: ''میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، اے دختر رسول خدا ﷺ! یہ لوح کیا ہے؟''

تو آپ نے فرمایا: ''یہ لوح خدا نے اپنے رسول کو تحفہ دی ہے، اس میں میرے بابا، میرے شوہر، میرے دو بیٹوں اور میری اولاد میں سے اوصیاء کے نام ہیں اور بابا نے یہ لوح مجھے عطا فرمائی ہے تاکہ اس کے ذریعے مجھے بشارت دیں۔''

جابر نے کہا: ''آپ کی والدہ گرامی حضرت فاطمہ - نے وہ لوح مجھے دی، میں نے اسے پڑھا اور اس سے ایک نسخہ اتارا۔''

میرے والد نے فرمایا: ''اے جابر، کیا وہ نسخہ مجھے دکھا سکتے ہو؟''

جابر نے کہا: ''ہاں''، پھر میرے والد اس کے ساتھ اس کے گھر گئے، وہاں پہنچ کر نازک کھال پر لکھا ہوا ایک صحیفہ نکالا اور فرمایا: ''اے جابر! جو میں بول رہا ہوں تم اپنے نوشتے سے ملاتے جاؤ۔''

جابر نے اپنے نسخہ پر نظر کی اور میرے والد نے اس کی قرائت کی، کسی ایک حرف میں بھی اختلاف نہ تھا۔ جابر کہتے ہیں: ''خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ لوح میں اس طرح لکھا ہوا دیکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ تحریر خداوند عزیز وحکیم کی طرف سے محمد کے لئے ہے جو اس کا پیغمبر، اس کا نور، اس کا سفیر، اس کا حجاب اور اس کی دلیل ہے، کہ جسے روح الامین نے رب العالمین کی طرف سے نازل کیا ہے۔ اے محمد! میرے ناموں کی تعظیم کرو، میری نعمتوں کا شکر بجالاؤ اور میرے الطاف باطنی کا انکار نہ کرو، بے شک میں وہ خدا ہوں جس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں، ظالموں کو توڑ دینے والا، مظلوموں کو حکومت عطا کرنے والا، جزا کے دن جزا دینے والا۔ بے شک میں ہی وہ خدا ہوں جس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے، جو کوئی بھی میرے فضل کے علاوہ کسی چیز کا امیدوار ہو یا میرے عدل کے علاوہ کسی چیز کا خوف کھائے اسے ایسا عذاب دوں گا کہ دنیا والوں میں سے کسی کو اس طرح کا عذاب نہ دیا ہوگا۔ بس میری عبادت کرو اور مجھ پر توکل کرو۔ بے شک ابھی تک میں نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ اس کے دن پورے ہونے اور مدت گزرنے سے پہلے اس کا وصی مقرر نہ کردیا ہو۔ بے شک میں نے تمہیں انبیاء پر اور تمہارے وصی کو اوصیاء پر فضیلت دی ہے، حسن اور حسین جیسے دو سبط وشبل عطا کر کے تمہیں احترام بخشا ہے۔

پس حسن کو اس کے والد کی مدت پوری ہونے کے بعد اپنے علم کی معدن قرار دیا ہے اور حسین کو میں نے اپنی وحی کا خزینہ دار قرار دیا ہے، اسے شہادت کے ذریعے عزت عطا کی، اس کا اختتام سعادت پر کیا، پس وہ تمام شہیدوں

سے افضل ہے اور اس کا درجہ تمام شہداء سے بڑھ کر ہے۔ اپنے کلمہ تامہ کو اس کے ساتھ اور اپنی حجت بالغہ کو اس کے پاس رکھا، اس کی عترت کے وسیلے سے ثواب دوں گا اور عقاب کروں گا۔ ان میں پہلا علی ہے جو سید العابدین اور میرے سابقہ اولیاء کی زینت ہے۔ اس کا فرزند محمد اپنے جد محمود کی شبیہ ہے، باقر، جو میرے علم کو شگافتہ کرنے والا ہے اور میری حکمت کا معدن ہے۔ جعفر میں شک وتردید کرنے والے جلد ہی ہلاک ہو جائیں گے اس کی بات ٹھکرانے والا ایسا ہے جیسے میری بات کو ٹھکرائے۔ میرا یہ قول حق ہے کہ جعفر کے مقام کو گرامی رکھتا ہوں اور اسے، اس کے پیروکاروں، انصار اور دوستوں کے درمیان مسرور کروں گا۔ اس کے بعد موسیٰ ہے کہ اس کے زمانے میں اندھا دتاریک فتنہ چھا جائے گا، چونکہ میرے فرض کا رشتہ منقطع نہیں ہوتا اور میری حجت مخفی نہیں ہوتی، بے شک میرے اولیاء سرشار جام سے سیراب ہوں گے، جو کوئی ان میں سے کسی ایک کا انکار کرے اس نے میری نعمت کا انکار کیا ہے اور جو کوئی میری کتاب میں سے ایک آیت میں بھی رد و بدل کرے اس نے مجھ پر بہتان باندھا ہے۔ میرے عبد، میرے حبیب اور میرے مختار، موسیٰ کی مدت تمام ہونے کے بعد وائے ہو علی کا انکار کرنے والوں اور اس پر بہتان باندھنے والوں پر جو میرا ولی، میرا مددگار رہے، نبوت کے سنگین بوجھوں کو اس کے کاندھوں پر رکھوں گا اور اس کی انجام دہی میں شدت وقوت سے آزماؤں گا، اسے ایک مستکبر عفریت قتل کرے گا اور جس شہر کی بنیاد، عبد صالح نے رکھی ہے اس میں بدترین مخلوق کے پہلو میں دفن ہوگا۔ میرا یہ قول حق ہے کہ اسے اس کے فرزند محمد کے ذریعے مسرور کروں گا جو اس کے بعد اس کا خلیفہ اور اس کے علم کا وارث ہوگا، پس وہ میرے علم کا معدن، میرا راز داں اور خلق پر میری حجت ہے۔ کوئی بھی اس پر ایمان نہیں لائے گا مگر یہ کہ بہشت کو اس کا مسکن بنادوں گا۔ اس کی شفاعت اس کے ستر اہل خانہ کے حق میں قبول کروں گا، جو آتش جہنم کے مستحق ہو چکے ہوں گے۔ اور سعادت کے ساتھ ختم کروں گا اس کے فرزند علی کے لئے جو میرا ولی، میرا مددگار، خلق کے درمیان میرا گواہ اور میری وحی میں میرا امین ہے۔ اس سے اپنی راہ کی جانب دعوت دینے والا حسن نکالوں گا، جو میرے علم کا خزینہ دار ہوگا اور اسے اس کے فرزند م ح م د سے کامل کروں گا، جو رحمۃ للعالمین ہے، جس میں موسیٰ کا کمال، عیسیٰ کی ہیبت اور صبر ایوب ہے۔ اس کے زمانے میں میرے اولیاء ذلیل ہوں گے اور ان کے سر، ترک ودیلم کے سروں کی طرح لوگ ایک دوسرے کو تحفے کے طور پر دیں گے۔ وہ مارے جائیں گے، جلائے جائیں گے، خوف زدہ، ڈرے ہوئے اور سہمے ہوئے ہوں گے، ان کے خون سے زمین رنگین ہوگی، ان کی عورتوں کی فریاد بلند ہوگی، حقا کہ وہ میرے اولیاء ہیں، ان کے ذریعے ہر اندھے

فتنے کی تاریکی وبختی کو دور کروں گا۔ ان کے ذریعے زلزلوں کو کشف کردوں گا، بوجھوں اور زنجیروں کو دور کروں گا۔ یہ وہ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے صلوات اور رحمت ہے اور یہی ہدایت پانے والے ہیں۔" (۲۰)

حدیث مکمل کرنے کے بعد ابوبصیر نے عبدالرحمٰن بن سالم سے کہا: "اگر ساری زندگی اس کے علاوہ کوئی دوسری حدیث نہ بھی سنو تو یہی ایک حدیث تمہارے لئے کافی ہے، اسے نااہل سے چھپا کر رکھنا۔"

اور ائمہ معصومین کی امامت پر اس سے کہیں زیادہ دلائل موجود ہیں، جنہیں اس مختصر مقدمے میں نہیں سمویا جا سکتا، لیکن امامت کے اعلیٰ مقام کی معرفت کی غرض سے ایک روایت ذکر کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں اور یہ روایت وہ ہے جسے شیخ المحدثین محمد بن یعقوب کلینی نے محمد بن یحییٰ سے (کہ نجاشی جس کی شان بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: شیخ أصحابنا فی زمانه، ثقة، عین، اور ان سے چھ ہزار کے قریب روایات نقل کی ہیں)، انہوں احمد بن محمد بن عیسیٰ سے (جو شیخ القمیین ووجههم وفقیههم غیر مدافع اور امام رضا، امام تقی وامام نقی علیہم السلام کے صحابی تھے)، انہوں نے حسن بن محبوب سے (جو اپنے زمانے کے ارکان اربعہ میں سے ایک اور ان فقہاء میں سے ہیں کہ جن تک صحیح سند اگر پہنچ جائے تو ان کی منقولہ روایت کی صحت پر اجماع ہے۔)، انہوں نے اسحاق بن غالب سے (بطور خاص توثیق کے علاوہ جن کی شان یہ ہے کہ صفوان بن یحییٰ جیسی عظیم شخصیت نے ان سے روایات نقل کی ہیں)، انہوں نے ابی عبداللہ - کے خطبے سے روایت نقل کی ہے، جس میں حضرت نے احوال وصفات ائمہ کو بیان کیا ہے۔ چونکہ کلام امام میں موجود خاص لطافت قابل توصیف نہیں ہے لہذا یہاں پر خود متن کا کچھ حصہ ذکر کرتے ہیں:

((عن ابی عبدالله علیه السلام فی خطبة له یذکر فیها حال الأئمة علیهم السلام و صفاتهم: إنّ الله عز و جل اوضح بأئمة الهدی من أهل بیت نبینا عن دینه، و أبلج بهم عن سبیل منهاجه، و فتح بهم عن باطن ینابیع علمه، فمن عرف من أمة محمد ﷺ واجب حق امامه، وجد طعم حلاوة ایمانه، و علم فضل طلاوة اسلامه، لأن الله تبارک و تعالی نصب الامام علماً لخلقه، و جعله حجة علی أهل مواده وعالمه، و ألبسه الله تاج الوقار، و غشاه من نور الجبار، یمد بسبب الی السماء، لا ینقطع عنه مواده، و لا ینال ما عند الله الا بجهة اسبابه، و لا یقبل الله اعمال العباد إلاّ بمعرفته، فهو عالم بما یرد علیه من ملتبسات الدجی، و معمّیات السنن، و مشبّهات الفتن، فلم یزل الله تبارک و تعالی یختارهم لخلقه من ولد الحسین - من عقب کل إمام

يصطفيهم لذلک و يجتبيهم، و يرضى بهم لخلقه و يرتضيهم، كلّ ما مضى منهم إمام نصب لخلقه من عقبه إماماً علما بيّناً، و هادياً نيّراً و إماماً قيّماً، و حجة عالماً، أئمة من اللّٰه، يهدون بالحق و به يعدلون، حجج اللّٰه و دعاته و رعاته على خلقه، يدين بهديهم العباد و تستهل بنورهم البلاد، و ينمو ببركتهم التلاد، جعلهم اللّٰه حياة للأنام، و مصابيح للظلام، و مفاتيح للكلام، و دعائم للإسلام، جرت بذلک فيهم مقادير اللّٰه على محتومها.

فالإمام هو المنتجب المرتضى، و الهادى المنتجى، و القائم المرتجى، اصطفاه اللّٰه بذلک و اصطنعه على عينه في الذرّ حين ذرأه، و في البرية حين برأه، ظلا قبل خلق نسمة عن يمين عرشه، محبوّاً بالحكمة في علم الغيب عنده، اختاره بعلمه، و انتجبه لطهره، بقية من آدم -و خيرة من ذرية نوح، و مصطفى من آل إبراهيم، و سلالة من إسماعيل، و صفوة من عترة محمد ﷺ لم يزل مرعيّاً بعين اللّٰه، يحفظه و يكلئه بستره، مطروداً عنه حبائل إبليس و جنوده، مدفوعاً عنه وقوب الغواسق و نفوث كل فاسق، مصروفاً عنه قوارف السوء، مبرّئاً من العاهات، محجوباً عن الآفات، معصوماً من الزّلات، مصوناً عن الفواحش كلها، معروفاً بالحلم و البرّ في يفاعه، منسوباً إلى العفاف و العلم و الفضل عند انتهائه، مسنداً إليه أمر والده، صامتاً عن المنطق في حياته.

فإذا انقضت مدّة والده، إلى أن انتهت به مقادير اللّٰه إلى مشيئته، و جائت الإرادة من اللّٰه فيه إلى محبته، و بلغ منتهى مدة والده - فمضى و صار أمر اللّٰه إليه من بعده، و قلده دينه، و جعله الحجة على عباده، و قيمه في بلاده، و أيّده بروحه، و آتاه علمه، و أنبأه فصل بيانه، و استودعه سرّه، و انتدبه لعظيم أمره، و أنبأه فضل بيان علمه، و نصبه علماً لخلقه، و جعله حجة على أهل عالمه، و ضياء لأهل دينه، و القيم على عباده، رضى اللّٰه به إماماً لهم......)).(۲۱)

اگر چہ اس حدیث کا ہر جملہ مفصل تشریح کا طالب ہے، لیکن ہم یہاں بعض جملوں سے متعلق چند نکات ذکر کرتے ہیں:

الف۔ پہلے جملے میں امام - نے ائمہ ہدیٰ کو خطبے کا موضوع قرار دیا، کیونکہ امت کے لئے وجود امام کی ضرورت

واضح ہے ﴿يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ﴾(۴۲)اور امت کے امام کا امامِ ہدایت ہونا ضروری ہے جیسا کہ خداوند متعال نے فرمایا:﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا﴾(۴۳)،﴿إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾(۴۴) اور امامِ ہدایت کی معرفت، معرفتِ ہدایت پر متوقف ہے۔معرفتِ ہدایت کے لئے اس موضوع سے متعلق قرآن مجید میں موجود ان آیات میں تدبر وتفکر ضروری ہے جن کی تعداد تقریباً دوسونوے ہے۔اس مقدمے میں ان کی تشریح کرنا مشکل ہے،اس لئے کہ ہدایت، کمالِ خلقت ہے ﴿قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ﴾(۴۵)،﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۞ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ ۞ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ﴾(۴۶) اور مخلوق میں ہر ایک کی ہدایت اس کی خلقت کے تناسب سے ہے۔اب چونکہ خلقتِ انسان کی اساس احسن تقویم ہے،لہذا اس کی ہدایت بھی عالم امکان کا سب سے بڑا کمال اور اشرف المخلوقات کو عنایت کی جانے والی بزرگترین نعمت ہے۔﴿وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا﴾(۴۷)امام - نے ((ائمه هدی)) فرما کر مقام امامت کی عظمت کو بیان فرمایا، بلکہ اہل نظر کے لئے تو امام کی خصوصیات کو واضح کردیا کہ ایسے ملزوم کے لئے کن لوازم کی ضرورت ہے۔پھر اس اجمال کے بعد تفصیل بیان کی، دین میں امام کے کردار پر روشنی ڈالی کہ خداوند متعال نے اپنے قانون کی تفسیر کا حق ایسی مخلوق کو عطا نہیں کیا جن کی آراء میں خطا اور اختلاف پایا جاتا ہے،اس لئے کہ ان دو آفتوں سے تشریع دین کی غرض نقض ہو جائے گی اور امت، نورِ ہدایت کی بجائے گمراہی کی تاریک وادیوں میں بھٹک جائے گی، بلکہ پروردگارِ عالم نے اصول وفروع دین میں، انسان کے لئے پیش آنے والے مبہم نقاط کو ائمہ ہدیٰ کے ذریعے دور کیا ہے((أن الله عزوجل أوضح بأئمة الهدى من أهل بيت نبينا عن دينه))

ب۔ چونکہ فطری تقاضے کے مطابق انسان اپنے خالق اور پروردگارِ عالم کی تلاش وجستجو میں ہے اور یہ فطرت راہ خدا تک،جو کہ دین خدا ہے، پہنچے اور اس پر ثابت قدم رہے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتی ﴿قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي﴾(۴۸)اور چونکہ اشتباہات اور خواہشاتِ نفسانی جیسے راہ خدا سے منحرف کرنے والے اسباب اور شیاطینِ جن وانس جیسے لٹیرے، ہر وقت موجود ہیں ﴿وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ﴾(۴۹)، ﴿اشْتَرَوْا بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِهِ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾(۵۰)لہذا تکوینِ فطرت کی غرض یعنی خدا تک رسائی کے حصول اور دین کی سیدھی راہ، جو خدا تک رسائی کی راہ ہے، کی تشریع کے لئے،ایک ایسے ہادی ورہبر کی ضرورت ہے جس کے نور سے یہ ہدف ومقصد پایۂ تکمیل تک پہنچ

سکے ((وابلج عن سبیل منهاجه)).

ج۔ انسان میں خلقتِ عقل کی غرض، علم ومعرفت کی حقیقت تک پہنچنا ہے اور ذاتِ انسان کی، خالقِ عقل وادراک سے یہ استدعا ہے کہ پروردگارا! ہر چیز کی حقیقت کو جیسی ہے ویسی ہی مجھ پر نمایاں کر دے۔ وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ کہاں سے آیا ہے؟ کہاں ہے؟ کس طرف جارہا ہے؟ اس کے وجود اور کائنات کا آغاز وانجام کیا ہے؟اور ادراکِ انسان کی یہ پیاس، علمِ الٰہی جیسے آبِ حیات کو حاصل کئے بغیر نہیں بجھ سکتی، ورنہ حکمت کا اخری مرحلہ بھی جو حیرة الکمل (کامل ترین افراد کے لئے مقام تحیر ہے) کا مقام ہے،اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسان یہ جان لے کہ میں نہیں جانتا۔یہی وجہ ہے کہ ایک ایسے الٰہی انسان کے وجود کی ضرورت ہے جو علومِ الٰہی کے سرچشموں کا وارث ہو، تاکہ تشنگانِ حقیقت اس کے ہاتھوں سیراب ہوں اور خلقتِ عقل وادراک کی غرض حاصل ہو، جیسا کہ امام نے ایک معتبر نص میں فرمایا ہے:((من زعم أن الله يحتج بعبد في بلاده ثم يستر عنه جميع ما يحتاج إليه فقد افترى على الله))(۳۱)

یقیناً یہ سمجھنا کہ خداوند متعال کسی کو اپنے بندے پر حجت قرار دے اور وہ تمام چیزیں جن کی اسے ضرورت ہے، اپنی حجت سے چھپالے اور ان کا علم اسے عطا نہ کرے تو یہ ایک ایسی تہمت ہے جو لامتناہی علم،قدرت اور حکمت کی عدم شناخت کی بنا پر لگائی گئی ہے۔اسی لئے فرمایا:((و فتح بهم عن باطن ينا بيع علمه)).

د۔ ((والبسه تاج الوقار)) علم اور قدرت ہے جوامام کے سر پر وقار کا تاج ہے،((فدلالة الامام فيما هي؟ قال:في العلم و استجابة الدعوة))(۳۲)اس لئے کہ انسان کے اضطراب اور پستی کی وجہ اس کا عجز اور اس کی جہالت ہے اور چوں کہ امام، کتاب خدا کا معلم ہے، جب کہ حدیث ثقلین کی صریح نص کے مطابق، کتاب خدا اور امام ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے اور اس آیت ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ﴾(۳۳) کے مطابق، قرآن ہر چیز کو بیان کرنے والا ہے،لہٰذا ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ قرآن میں موجود تمام علوم پر احاطہ نہ رکھتا ہو اور یہ بات اس معتبر حدیث سے ثابت ہے ((عن ابن بكير عن ابى عبد الله - قال:كنت عنده فذكروا سليمان وما أعطى من العلم وما أوتى من الملك، فقال - لي:وما أعطى سليمان ابن داود إنما كان عنده حرف واحد من الإسم الأعظم، وصا حبكم الذى قال الله قل كفى بالله شهيدا بيني وبينكم ومن عنده علم الكتاب، وكان والله عند عليّ علم الكتاب، فقلت:صدقت

واللہ، جعلت فداک)) امر اللہ سے مرحط ہونے کی بنا پر امام (۳۴) مستجاب الدعوہ ہے اور اسی علم وقدرت کی وجہ سے تاجِ وقار، امام کے سر مبارک کی زینت ہے۔

ہ۔ ((وغشاہ من نور الجبار)) لفظ نور، اسم مقدس جبار کی طرف اضافہ ہوا ہے۔ اسماء الٰہی کی جانب اضافہ ہونے والا ہر اسم اضافے کی وجہ سے اسی اسم کی خصوصیات کسب کر لیتا ہے اور خداوند عالم جبار ہونے کے ناطے ہر ٹوٹ پھوٹ کا مداوا کرنے والا ہے ((یا جابر العظم الکسیر))(۳۵)، امام کے وجود کو نور جبار کے نور سے منور کیا گیا ہے تاکہ پیکرِ اسلام و مسلمین میں پڑنے والی دراڑوں کا اس نور کے ذریعے مداوا و ازالہ کر سکے۔

و۔ ((ائمة من اللّٰہ یھدون بالحق وبہ یعدلون)) امام وہ ہے جو خدا کے اختیار سے مختار، اس کے برگزیدہ کرنے سے مصطفیٰ اور اس کے انتخاب سے امامت و رہبری کے لئے مجتبیٰ ہے۔ اسی لئے ضروری ہے کہ ایک امام کی رحلت کے بعد پروردگار عالم دوسرا امام نصب کرے جو واضح علامت، راہِ دین کو روشن کرنے والا ہادی، سرپرستی کرنے والا رہبر اور صاحب علم حجت ہو تاکہ خلقتِ انسان اور بعثتِ انبیاء کی غرض جو دو کلموں میں خلاصہ ہوتی ہے، حاصل ہو سکے اور وہ دو کلمے، حق کی جانب ہدایت اور حق کے ساتھ عدالت کا برقرار کرنا ہے جو نظری اور عملی حکمت کا لب لباب اور انسان کے ارادے و عقل کا نقطہ کمال ہے اور ان دو کا تحقق سوائے ایسی عقل، جو ہر چیز کو اس کی حقیقت کے ساتھ جان لے، اور ایسے ارادے، جو ہر کام کو اس کی اصل وحقیقت کے مطابق انجام دے، کے بغیر ناممکن ہے جو علمی اور عملی عصمت کا منصب ہے، لہٰذا فرمایا ((ائمة من اللّٰہ یھدون بالحق وبہ یعدلون))

ز۔ ((اصطفاہ اللّٰہ بذلک واصطنعہ علی عینہ فی الذر حین ذراہ)) امام وہ ہے جس کے گوہر وجود کو خود پروردگار عالم نے عالم ذر میں عرش کے دائیں بنایا، اپنی نگرانی میں اس کی تربیت فرمائی اور علم غیب کے ذریعے جو اس ذات مقدس کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں ﴿إِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَسُوْلٍ﴾(۳۶) اسے حکمت عطا کی ہے۔ خلقت میں نسب کے اعتبار سے ذریت نوح کا بہترین، آل ابراہیم کا برگزیدہ، سلالۂ اسماعیل اور عترت محمدؐ سے منتخب شدہ ہے۔

اس کا جسم تمام عیوب سے منزہ، جب کہ روح ہر قسم کی لغزش سے معصوم اور ہر گناہ سے محفوظ ہے۔

ابلیس، جس نے کہا تھا کہ ﴿فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ ۞ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ﴾(۳۷) امام کی مقدس ذات سے اس قدرت کی وجہ سے دور ہے کہ ﴿إِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ﴾(۳۸)

((وصار أمر اللّٰہ إلیہ من بعد))،وہ امر اللہ کو جو ایک امام کے بعد دوسرے کو نصیب ہوتا ہے، چھٹے امام -نے حدیث صحیحہ میں یوں بیان فرمایا ہے:((إن اللّٰہ واحد متوحد بالواحدانیۃ، متفرد بامرہ فخلق خلقا فقدرہ لذلک الامر، فنحن ھم یابن ابی یعفور، فنحن حجج اللّٰہ فی عبادہ وخزانہ علی علمہ والقائمون بذلک))(۳۹)

ح۔ ((وأیدہ بروحہ)) جس روح کے ساتھ خدا نے امام کی تائید فرمائی ہے یہ وہ روح ہے جسے ابوبصیر نے حدیث صحیحہ میں بیان کیا ہے:"میں نے ابی عبداللہ -کو یہ فرماتے ہوئے سنا:﴿وَيَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّيْ﴾(۴۰)جو جبرئیل ومکائیل سے بھی اعظم مخلوق ہے۔گذشتگان میں سے محمد ﷺ کے علاوہ کسی اور کو عطا نہیں کی گئی اور وہ روح اب ائمہ کے پاس ہے جو استقامت وثابت قدمی میں ان کی مدد کرتی ہے۔..."(۴۱)

((وآتاہ علمہ))اور اسے اپنا علم عطا فرمایا ہے۔امام محمد باقر -سے مروی صحیح نص کے مطابق خدا کے دو علم ہیں، ایک علم وہ ہے جسے اس کی ذات کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں جانتا اور دوسرا علم وہ ہے جسے اس ذات اقدس نے ملائکہ وپیغمبران علیہم السلام کو تعلیم فرمایا ہے اور جس علم کی ملائکہ وانبیاء علیہم السلام کو تعلیم دی ہے، امام اس سے آگاہ ہے۔(۴۲)

((واستودعہ سرہ))اور اپنا راز اس کے سپرد کیا ہے۔صحیح حدیث کے مطابق امام ابوالحسن -نے فرمایا:"خدا نے اپنا راز جبرئیل -کے سپرد کیا، جبرئیل نے محمد ﷺ کے سپرد کیا اور محمد ﷺ نے اس کے سپرد کیا جس کے بارے میں خود خدا نے چاہا۔"(۴۳)

ط۔((رضی اللّٰہ بہ إماما لھم))اس میں کسی قسم کے شک وتردید کی گنجائش نہیں کہ امت کو امام کی ضرورت ہے اور امت کے امام کا خدا کا مورد پسند ہونا ضروری ہے۔وہ خدا جو علم وجہل میں سے علم کو پسند فرماتا ہے﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لاَ يَعْلَمُوْنَ﴾(۴۴)،سلامتی وآفت میں سے سلامتی کو پسند فرماتا ہے﴿يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلاَمِ﴾(۴۵)،حکمت وسفاہت میں سے حکمت کو پسند فرماتا ہے﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْراً كَثِيْرًا﴾(۴۶)،عدل وفسق میں سے عدل کو پسند فرماتا ہے﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾(۴۷)،حق وباطل میں سے حق کو پسند فرماتا ہے ﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ

الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقاً﴾(۴۸)، اور صواب وخطا میں سے صواب کو پسند فرماتا ہے﴿لَا يَتَكَلَّمُوْنَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَاباً﴾(۴۹)، امت کی اطاعت کے لئے بھی یقیناً اس کو پسند فرمائے گا جس کی امامت علم، عدل، سلامتی، حکمت، صواب، حق اور ہدایت کی امامت ہو۔ ساتھ اس کے کہ بہترین کا انتخاب کرنا خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے ﴿اَلَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَهُ﴾(۵۰)، بہترین کو ہی حاصل کرنے کا حکم فرمایا ہے ﴿وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوْا بِأَحْسَنِهَا﴾(۵۱)اور بہترین قول کا حکم دیا ہے ﴿قُلْ لِعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ ﴾(۵۲) اور مجادلے کے وقت بہترین طریقے سے گفتگو کرنے کا حکم فرمایا ہے ﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ﴾(۵۳)اور رد کرتے وقت، بہترین طریقے سے رد کرنے کی تلقین فرمائی ہے ﴿إِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ﴾(۵۴)اور جو خود ہی احسن جزا دینے والا ہے ﴿وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾(۵۵)اور جو خود بہترین حدیث نازل کرنے والا ہے﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيْثِ﴾(۵۶)، کیا ممکن ہے امت کی امامت کے لئے اکمل، افضل، اعلم، اعدل اور اس احسن حدیث میں موجود تمام صفات کے مالک کے علاوہ کسی اور کو پسند فرمائے؟!

جب احسن کی اتباع کے حکم کا لازمہ یہ ہے کہ احسن کی پیروی ہو تو کیسے ممکن ہے کہ پروردگار عالم کسی غیر احسن کی امامت و پیروی سے راضی ہو جائے؟!

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْماً لِقَوْمٍ يُوْقِنُوْنَ﴾(۵۷)اور اسی لئے فرمایا:((وانتدبه بعظيم أمره وأنباه فضل بيان علمه ونصبه علما لخلقه وجعله حجة على أهل عالمه وضياء لأهل دينه والقيم على عباده رضي الله به إماما لهم)).

امام زمانہ

رسول خدا ﷺ کی فریقین سے مروی اس روایت کے مطابق کہ جو شخص اس دنیا میں اپنے زمانے کے امام کو پہچانے بغیر مر جائے اس کی موت جاہلیت کی موت ہے(۱)، اگر چہ امام زمانہ - کی تفصیلی معرفت تو میسر نہیں ہے لیکن اجمالی معرفت کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔

ہر زمانے میں امامِ معصوم کی ضرورت، عقلی و نقلی دلائل کے ذریعہ بحثِ امامت میں ثابت ہو چکی ہے۔

عقلی دلائل کا اجمالی طور پر خلاصہ یہ ہے کہ نبوت و رسالت کا دروازہ پیغمبر خاتم ﷺ کے بعد ہمیشہ کے لیے

بند ہو چکا ہے۔ لیکن قرآن کو سمجھنے کے لئے، جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوا ہے اور ہمیشہ کے لئے انسان کی تعلیم وتربیت کا دستور العمل ہے، معلم ومربی کی ضرورت ہے۔ وہ قرآن، جس کے قوانین مدنی الطبع انسان کے حقوق کے ضامن تو ہیں لیکن ایک مفسر اوران قوانین کو عملی جامہ پہنانے والے کے محتاج ہیں۔

بعثت کی غرض اس وقت تک محقق نہیں ہو سکتی جب تک کہ تمام علوم قرآنی کا معلم موجود نہ ہو۔ایسے بلند مرتبہ اخلاقی فضائل سے آراستہ ہو کہ جو ((انما بعثت لأتمم مکارم الأخلاق))(۲) کا مقصد ہے. نیز ہر خطا وخواہشات نفسانی سے پاک ومنزہ ہو جس کے سائے میں انسان اس علمی وعملی کمال تک پہنچے جو خداوند تعالیٰ کی غرض ہے. ﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ﴾(۳)

مختصر یہ کہ قرآن ایسی کتاب ہے جو تمام انسانوں کو فکری، اخلاقی اور عملی ظلمات سے نکال کر عالم نور کی جانب ہدایت کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے ﴿كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾(۴)

اس غرض کا حصول فقط ایسے انسان کے ذریعے ممکن ہے جو خود ظلمات سے دور ہو اور اس کے افکار، اخلاق و اعمال سراپا نور ہوں اور اسی کو امام معصوم کہتے ہیں۔

اور اگر ایسا انسان موجود نہ ہوتو تعلیم کتاب وحکمت اور امت کے درمیان عدل کا قیام کیسے میسر ہوسکتا ہے؟ اور خود یہی قرآن جو اختلافات کو ختم کرنے کے لئے نازل ہوا ہے، خطا کار افکار اور ہوئی و ہوس کے اسیر نفوس کی وجہ سے، اختلافات کا وسیلہ وآلہ بن کر رہ جائے گا۔

آیا وہ خدا جو خلقتِ انسان میں احسن تقویم کو مدنظر رکھتے ہوئے انسان کی ظاہری خوبصورتی کے لیے بھنوں تک کا خیال رکھ سکتا ہے، کیا ممکن ہے کہ مذکورہ ہدف ومقصد کے لئے کتاب تو بھیج دے لیکن بعثت انبیاء اور کتب نازل کرنے کی اصلی غرض، جو سیرت انسان کو احسن تقویم تک پہچانا ہے، باطل کر دے؟!

اب تک کی گفتگو سے رسول خدا ﷺ کے اس کلام کا نکتہ واضح وروشن ہو جاتا ہے کہ جسے اہل سنت کی کتابوں نے نقل کیا ہے ((من مات بغیر إمام مات میتة جاهلیة))(۵) اور کلام معصومین علیہم السلام کا نکتہ بھی کہ جسے متعدد مضامین کے ساتھ شیعی کتب میں نقل کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا - نے شرائع

دین سے متعلق، مامون کو جو خط لکھا اس کا مضمون یہ ہے ((وإن الارض لا تخلو من حجة اللّٰه تعالی علی خلقه فی کل عصر وأوان و إنهم العروة الوثقی)) یہاں تک کہ آپ - نے فرمایا ((ومن مات ولم یعرفهم مات میتة جاهلیة))(۲)

اب جب کہ اکمال دین واتمام نعمت ہدایت میں ایسی شخصیت کے وجود کی تاثیر واضح ہو چکی، اگر اس کی عدم موجودگی سے خدا اپنے دین کو ناقص رکھے تو اس عمل کی وجہ یا تو یہ ہوگی کہ ایسی شخصیت کا وجود ناممکن ہو یا خدا اس پر قادر نہیں اور یا پھر خدا حکیم نہیں ہے اور ان تینوں کے واضح بطلان سے امام کے وجود کی ضرورت ثابت ہے۔

حدیث ثقلین جس پر فریقین کا اتفاق ہے، ایسی شخصیت کے وجود کی دلیل ہے جو قرآن سے اور قرآن جس سے، ہرگز جدا نہ ہوں گے اور چونکہ مخلوق پر خدا کی حجت، حجت بالغہ ہے، ابن حجر ہیثمی جس کا شیعوں کی نسبت تعصب ڈھکا چھپا نہیں، کہتا ہے ((والحاصل أن الحث وقع علی التمسک بالکتاب وبالسنة وبالعلماء بهما من أهل البیت ویستفاد من مجموع ذلک بقاء الأمور الثلاثة إلی قیام الساعة، ثم اعلم أن لحدیث التمسک بذلک طرقاً کثیرةً وردت عن نیف وعشرین صحابیا))(۷)

ابن حجر اعتراف کر رہا ہے کہ حدیث ثقلین کے مطابق، جسے بیس سے زیادہ اصحاب نے پیغمبر اکرم ﷺ سے نقل کیا ہے، پوری امت کو کتاب، سنت اور علماء اہل بیت سے تمسک کا حکم دیا گیا ہے اور ان سب سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ تینوں قیامت کے دن تک باقی رہیں گے۔

اور مذہب حق یہی ہے کہ قرآن کے ہمراہ اہل بیت علیہم السلام سے ایسے عالم کا ہونا ضروری ہے جو قرآن میں موجود تمام علوم سے واقف ہو، کیوں کہ پوری امت مسلمہ کو، بغیر کسی استثناء کے، کتاب، سنت اور اس کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے، اور ہر ایک کی ہدایت کا دارومدار اسی تمسک پر ہے۔

اور روائی نقطہ نگاہ سے: بارہویں امام - کے متعلق شیعوں کا اعتقاد اور آپ کا ظہور معصومین علیہم السلام سے روایت شدہ متواتر نصوص سے ثابت ہے، جو اثبات امامت کے طریقوں میں سے ایک ہے۔

قرآن مجید میں ایسی آیات موجود ہیں، جنہیں شیعہ وسنی کتب میں امام مہدی - کی حکومت کے ظہور سے تفسیر کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض کو ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

۱۔ ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾(۸)
ابوعبداللہ گنجی کتاب ''البیان فی اخبار صاحب الزمان-'' میں کہتا ہے کہ: ''اور بالتحقیق، مھدی کی بقا کا تذکرہ قرآن وسنت میں ہوا ہے۔ قرآن میں یوں کہ سعید بن جبیر قرآن میں خداوند متعال کے اس فرمان ﴿لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾ کی تفسیر میں کہتے ہیں:((ھو المھدی من عترة فاطمه علیها السلام))''(۹)

۲۔ ﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ﴾(۱۰)
فخر رازی کہتا ہے: ''بعض شیعوں کے عقیدے کے مطابق غیب سے مراد مھدی منتظر - ہے، کہ جس کا وعدہ خدا نے قرآن اور حدیث میں کیا ہے۔ قرآن میں یہ کہہ کر ﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ اور حدیث میں قول پیغمبر اکرم ﷺ کے اس قول کے مطابق ((لو لم یبق من الدنیا إلا یوم واحد لطول اللّٰه ذلک الیوم حتی یخرج رجل من أهل بیتی یواطی اسمه اسمی و کنیته کنیتی، یملأ الأرض عدلا وقسطا کما ملئت جورا وظلما))(۱۱)، اس کے بعد یہ اشکال کرتا ہے کہ بغیر دلیل کے مطلق کو تخصیص دینا باطل ہے۔''(۱۲)
فخر رازی نے ، حضرت مھدی موعود - کے بارے میں قرآن وحدیث پیغمبر خدا ﷺ کی دلالت کو تسلیم کرنے اور آپ - کی غیب میں شمولیت کے اعتراف کے بعد، یہ سمجھا ہے کہ شیعہ، غیب کو فقط حضرت مھدی - سے اختصاص دینے کے قائل ہیں، جب کہ فخر رازی اس بات سے غافل ہے کہ شیعہ امام مھدی - کو مصادیق غیب میں سے ایک مصداق مانتے ہیں۔

۳۔ ﴿وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُونِ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ﴾(۱۳)
ابن حجر کے بقول: ''مقاتل بن سلیمان اور اس کے پیروکار مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت مھدی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔''(۱۴)

۴۔﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا

يَعْبُدُونَنِي لَايُشْرِكُونَ بِيْ شَيْئاً وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾(۱۵)

اس آیت کو امام مہدی - اور آپ کی حکومت سے تفسیر کیا گیا ہے۔(۱۶)

۵۔ ﴿إِنْ نَّشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ﴾(۱۷)

اس آیت میں لفظ ((آیة)) کی تفسیر، حضرت مہدی - کے ظہور کے وقت دی جانے والی ندا کو بتلایا گیا ہے، جسے تمام اہل زمین سنیں گے اور وہ ندا یہ ہوگی ((ألا إن حجة الله قد ظهر عند بيت الله فاتبعوه فإن الحق معه وفيه))(۱۸)

۶۔ ﴿وَنُرِيْدُ أَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِيْنَ﴾(۱۹)

امیر المومنین - فرماتے ہیں: ''یہ دنیا منہ زوری دکھانے کے بعد پھر ہماری طرف جھکے گی جس طرح کاٹنے والی اونٹنی اپنے بچے کی طرف جھکتی ہے۔'' اس کے بعد مذکورہ آیت کی تلاوت فرمائی۔(۲۰)

۷۔ ﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ﴾(۲۱)

اس آیت کو امام مہدی - اور آپ - کے اصحاب کے بارے میں تفسیر کیا گیا ہے۔(۲۲) اور اس آیت کا مضمون، یعنی زمین پر صالح افراد کی حکومت، زبور حضرت داود - میں موجود ہے:

کتاب مزامیر۔ زبور حضرت داود -، سینتیسویں مزمور کی انتیسویں آیت میں ہے: ''اور نسل شریر منقطع ہوجائے گی اور صالح افراد زمین کے وارث ہوں گے اور اس میں ابد تک رہیں گے، صالح دہان حکمت کو بیان کرے گا اور اس کی زبان انصاف کا تذکرہ کرے گی۔ اس کے خدا کی شریعت اس کے دل میں ہوگی۔ لہذا اس کے قدم نہ لڑکھڑائیں گے۔''

کتاب مزامیر کے بہترویں مزمور کی پہلی آیت: ''اے خدا بادشاہ کو اپنا انصاف اور اس کے فرزند کو اپنی عدالت عطا کر اور وہ تیری قوم کے درمیان عدالت سے فیصلہ کرے گا اور تیرے مساکین کے ساتھ انصاف کرے گا۔ اس وقت پہاڑ، قوم کے لئے سلامتی کا سامان مہیا کریں گے اور ٹیلے بھی۔ قوم کے مساکین کے درمیان عدالت برقرار کرے گا، فقراء کی اولاد کو نجات دلائے گا اور ظالموں کو سرنگوں کرے گا اور جب تک سورج اور چاند اپنے سارے طبقات کے ساتھ باقی ہیں وہ تجھ سے ڈریں گے۔ وہ کٹے ہوئے سبزہ زاروں پر برسنے والی بارش کی طرح برسے گا

اور زمین کو سیراب کرنے والی بارشوں کی طرح اس کے دور میں صالح افراد خوب پھلے پھولیں گے اور سلامتی ہی سلامتی ہوگی، یہاں تک کہ چاند نابود ہو جائے گا، ایک سمندر سے دوسرے سمندر اور نہر سے دنیا کے آخری کونے تک اس کی حکومت ہوگی، اس کے سامنے صحرا نشین گردنیں جھکائیں گے اور اس کے دشمن خاک چاٹیں گے۔"

آپ - کے بارے میں فریقین کی کتابوں میں تواتر کی حد تک روایات موجود ہیں۔ ابوالحسن ابری، جو اہل سنت کے بزرگ علماء میں سے ہے، کا کہنا ہے: "راویوں کی کثیر تعداد نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے مہدی کے بارے میں روایت کی ہے جو متواتر و مستفیض ہیں اور یہ کہ وہ اہل بیت پیغمبر ﷺ سے ہے، سات سال حکومت کرے گا، زمین کو عدل سے پر کردے گا، حضرت عیسی - خروج کریں گے اور دجال کو قتل کرنے میں آپ - کی مدد کریں گے۔ امت کی امامت مہدی - کرائیں گے جب کہ عیسیٰ - آپ کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔"(۲۴)

شبلنجی نورالابصار میں کہتا ہے: "پیغمبر اکرم ﷺ سے متواتر احادیث ہیں کہ مہدی - آپ ﷺ کے اہل بیت سے ہے اور زمین کو عدل سے پر کردے گا۔"(۲۳)

ابن ابی حدید معتزلی کہتا ہے: "فرقہ ہائے مسلمین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دنیا اور دینی ذمہ داریاں حضرت مہدی - پر ختم ہوں گی۔"(۲۵)

زینی دحلان کے بقول: "جن احادیث میں مہدی - کے ظہور کا ذکر ہوا ہے وہ بہت زیادہ اور متواتر ہیں۔"(۲۶)

آپ - کی خصوصیات اور شمائل کو تو اس مختصر مقدمے میں تحریر نہیں کیا جاسکتا، لیکن پھر بھی شیعہ اور سنی کتب میں مذکور چند خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ نماز جماعت میں افضل کو تقدم حاصل ہے، جیسا کہ یہ مطلب سنی اور شیعہ روایات میں ذکر ہوا ہے: ((امام القوم وافدھم فقدموا افضلکم))(۲۷) آپ - کے ظہور اور حکومت حقہ کے قیام کے وقت عیسیٰ بن مریم - آسمان سے زمین پر تشریف لائیں گے اور سنی اور شیعہ روایات کے مطابق آپ - کی امامت میں نماز ادا کریں گے۔(۲۸)

وہ ایسی ہستی ہیں کہ کلمۃ اللہ، روح اللہ اور مردوں کو حکم خدا سے زندہ کرنے والے اولوالعزم رسول سے افضل ہیں اور آپ کی وجاہت اور قرب، خدائے ذوالجلال کے نزدیک زیادہ ہے۔ وقت نماز، جو خدا کی طرف عروج کا وقت

ہے، عیسیٰ بن مریم آپ کی اقتدا کریں گے اور آپ کی زبان مبارک کے ذریعے خدا سے ہم کلام ہوں گے۔

گنجی نے البیان میں نماز و جہاد میں آپ کی امامت کے بارے میں مروی روایات کے صحیح ہونے اور ان تقدم و امامت کے اجماعی ہونے کی تصدیق کے بعد، مفصل بیان کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ اس امامت کو معیار قرار دیتے ہوئے آپ، عیسیٰ سے افضل ہیں۔(۳۹)

عقد الدرر، باب اول میں سالم اشل سے روایت نقل کی ہے کہ وہ کہتا ہے: "میں نے ابی جعفر محمد بن علی الباقر (علیہما السلام) کو فرماتے سنا کہ: موسیٰ نے نظر کی تو پہلی نظر میں وہ کچھ دیکھا جو قائم آل محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) [illegible] موسیٰ نے کہا: اے پروردگار! مجھے قائم آل محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قرار دے۔ ان سے کہا گیا: کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذریت سے ہے۔ دوسری بار بھی اس کی مانند دیکھا اور دوبارہ وہی درخواست کی اور وہی جواب سنا، تیسری بار بھی اسی کو دیکھا اور سوال کیا تو تیسری بار بھی وہی جواب ملا۔"(۴۰)

باوجود اس کے کہ حضرت موسیٰ بن عمران پانچ اولوالعزم پیغمبر وکلیم اللہ ہیں ﴿وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا﴾(۴۱) اور خدا نے انہیں نو آیات کے ساتھ مبعوث فرمایا ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ﴾(۴۲) اور مقرب درگاہ باری تعالیٰ ہیں ﴿وَنَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا﴾(۴۳)، حضرت مہدی کے لئے وہ کیا مقام و منزلت تھی جسے دیکھنے کے بعد پانے کی آرزو میں حضرت موسیٰ نے خدا سے تین مرتبہ درخواست کی۔

حضرت موسیٰ بن عمران کا آپ کے مقام کو پانے کی آرزو کرنا ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی اور حدیث و روایت کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ حضرت عیسیٰ جیسے اولوالعزم پیغمبر کا آپ کی اقتدا میں نماز پڑھنا اس مقام کی حسرت و آرزو کے لیے کافی ہے۔ اس کے علاوہ عالم و آدم کی خلقت کا نتیجہ اور آدم سے لے کر خاتم تک تمام انبیاء کی بعثت کا خلاصہ ان چار نکات میں منحصر ہے:

الف۔ معرفت و عبادت خدا کے نور کا ظہور، جو ساری دنیا کو منور کر دے ﴿وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا﴾(۴۴)

ب۔ کائنات کو علم و ایمان سے بھرپور زندگی عطا ہونا جو ﴿اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾(۴۵) کا بیان ہے۔

ج۔ باطل کے زوال اور حق کی حکومت کا قائم ہونا جو ﴿وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾(۳۰) کی تجلی ہے۔

د۔ تمام انسانوں کا عدل و انصاف کو اپنانا، جو تمام انبیاء و رسل کے ارسال اور کتب کے نزول کی علت غائی ہے ﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَ أَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾(۳۱)

ان تمام آثار کا ظہور قائم آل محمد ﷺ کے ہاتھوں ہوگا ((یملأ اللّٰہ بہ الأرض قسطا و عدلا بعد ما ملئت جورا و ظلما))(۳۲) اور یہ وہ مقام ہے جس کی حسرت و آرزو آدم سے لے کر اب تک تمام انبیاء نے کی ہے۔

۱۔ سنی اور شیعہ روایات میں آپ؏ کو خلیفۃ اللہ کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے ((یخرج المہدی و علی رأسہ غمامۃ فیہا مناد ینادی: ھذا المہدی خلیفۃ اللّٰہ فاتبعوہ))(۳۳) اللہ جیسے مقدس اسم کی طرف اضافے کا تقاضا یہ ہے کہ آپ؏ کا وجود تمام اسماء حسنیٰ کی آیت ہے۔

۲۔ آپ؏ کے مقام کی عظمت و بلندی آپ کے اصحاب کے مقام و منزلت سے روشن ہوتی ہے، جس کا ایک نمونہ روایات اہل تسنن میں یہ ہے کہ: ”آپ؏ کے اصحاب کی مقدار، اہل بدر کی تعداد کے برابر ہے(۳۴) اور ان پر تلواریں ہیں کہ ہر تلوار پر ایک کلمہ لکھا ہوا ہے جو ہزار کلمات کی کنجی ہے۔“(۳۵)

اور روایات اہل سنت میں بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ایک صحیح روایت کا مجموعہ مربوط حصہ، جسے حاکم نیشاپوری نے مستدرک اور ذہبی نے تلخیص میں نقل کیا ہے، یہ ہے ((لا یستوحشون الی أحد و لا یفرحون بأحد یدخل فیہم علی عدۃ أصحاب بدر لم یسبقہم الأولون و لا یدرکہم الآخرون و علی عدۃ أصحاب طالوت الذین جاوزوا معہ النہر))(۳۶)

۳۔ رسول اکرم ﷺ اور حضرت مہدی میں خاتمیت کی مشترکہ خصوصیت اس بات کی متقاضی ہے کہ جس طرح نبوت آپؐ پر ختم ہوئی اسی طرح امامت حضرت مہدی پر ختم ہوگی، لہٰذا دین کا آغاز آنحضرتؐ کے دست مبارک سے ہوا اور اختتام حضرت مہدی کے ہاتھوں ہوگا۔ اسی نکتے کی جانب شیعہ اور سنی روایات میں اشارہ کیا گیا ہے کہ آنحضور نے فرمایا: ((المہدی منا یختم الدین بنا کما فتح بنا))(۳۷) آپ؏ میں خاتم کی جسمانی، روحانی اور اسکی تمام خصوصیات جلوہ گر ہیں۔

دو مختلف شخصیات، یعنی خاتم النبین وخاتم الوصیین کا کنیت، اسم، سیرت وصورت کے اعتبار سے ایک ہونا یعنی ابوالقاسم محمد پر دین کا افتتاح واختتام، اہل فکر کے لئے ایسے نازک اور اک بمقام ومرتبے کی حکایت کرتا ہے جو ناقابل بیان ہے۔

اس بارے میں بطور خاص واردشدہ بعض روایات ملاحظہ ہوں:

الف۔ رسول خدا ﷺ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"میری امت میں ایسا فرد ظہور کرے گا کہ اس کا نام میرا نام اور اس کا اخلاق میرا اخلاق ہے، زمین کو عدل وانصاف سے اس طرح پر کردے گا جس طرح ظلم وجور سے بھر چکی ہوگی۔"(۷۷)

ب۔ ایک صحیح روایت کے مطابق جسے جعفر بن محمد علیہما السلام نے اپنے آباء واجداد اور انہوں نے رسول خدا ﷺ سے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"مہدی میری اولاد سے ہے جس کا نام میرا نام اور اس کی کنیت میری کنیت ہے۔ خلق وخلق میں مجھ سے سب سے زیادہ شباہت رکھتا ہے۔ اس کے لئے ایسی غیبت اور حیرت ہے کہ لوگ دین سے گمراہ ہوجائیں گے، پھر اس کے بعد وہ شہاب ثاقب کی مانند ظہور کرے گا اور زمین کو عدل وانصاف سے اس طرح پر کردے گا جس طرح ظلم وجور سے بھر چکی ہوگی۔"(۷۸)

ج۔ ایک صحیح نص کے مطابق چھٹے امام جعفر بن م[illegible]م نے اپنے آباء اور انہوں نے رسول خدا ﷺ سے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:"جو میری اولاد میں سے قائم کا انکار کرے، یقیناً اس نے میرا انکار کیا ہے۔"(۷۹)

د۔ شیخ صدوق اعلی اللہ مقامہ نے دو واسطوں سے احمد بن اسحاق بن سعد الاشعری سے، جو نہایت ہی بزرگ ثقہ افراد میں سے ہیں، نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا:"میں حسن بن علی علیہما السلام کی خدمت میں ان کے بعد ان کے جانشین کے متعلق سوال کرنے کی غرض سے حاضر ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں سوال کرتا آپ نے فرمایا:"اے احمد بن اسحاق اللہ تبارک وتعالی نے جب سے آدم کو خلق کیا ہے زمین کو اپنی حجت سے خالی نہیں رکھا اور نہ ہی اسے قیامت تک اپنی حجت سے خالی رکھے گا۔ وہ اپنی حجت کے ذریعے اہل زمین سے بلاؤں کو دور کرتا ہے، اس کے وسیلے سے بارش برساتا ہے اور اس کے وجود کی بدولت زمین سے برکات نکالتا ہے۔"

احمد بن اسحاق کہتے ہیں، میں نے پوچھا: "یا بن رسول اللہ! آپ کے بعد امام و خلیفہ کون ہے؟"

حضرت امام حسن عسکری = اٹھے، تیزی سے گھر میں داخل ہوئے اور جب باہر تشریف لائے تو آپ = اپنے شانے پر ایک تین سالہ بچے کو لئے ہوئے تھے جس کا چہرہ چودہویں کے چاند کی طرح دمک رہا تھا، اس کے بعد آپ = نے فرمایا: "اے احمد بن اسحاق! اگر تم خدا اور اس کی حجتوں کے لئے محترم نہ ہوتے تو تمہیں اپنے بیٹے کی زیارت نہ کراتا، یہ پیغمبر خدا ﷺ کا ہمنام اور ہم کنیت ہے۔ یہ وہ ہے جو زمین کو عدل و انصاف سے اس طرح پر کر دے گا جس طرح ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔

اے احمد بن اسحاق! اس امت میں اس کی مثال خضر و ذوالقرنین کی ہے۔ خدا کی قسم، اس کی غیبت ایسی ہوگی کہ ہلاکت سے اس کے سوا کوئی نہ بچ سکے گا جسے خدا اس فرزند کی امامت پر ثابت قدم رکھے اور جسے خدا نے دعائے تعجیل فرج کی توفیق عنایت کی ہو۔"

پھر احمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: "اے میرے آقا! کیا کوئی علامت ہے جس سے میرا دل مطمئن ہو جائے؟"

اس بچے نے فصیح عربی میں کہا: ((أنا بقية الله في أرضه والمنتقم من أعداء الله)) میں اس زمین پر بقیۃ اللہ اور دشمنان خدا سے انتقام لینے والا ہوں۔ اے احمد بن اسحاق! دیکھنے کے بعد طلب اثر نہ کرو۔"

احمد بن اسحاق کہتا ہے کہ میں مسرور و خوشحال باہر آیا اور اگلے دن امام = کی خدمت میں جا کر عرض کی: "یا ابن رسول اللہ! آپ = نے مجھ پر جو احسان فرمایا اس سے میری خوشی میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے۔ اس بچے میں خضر و ذوالقرنین کی صفت کو بھی میرے لئے بیان فرمایئے؟"

امام = نے فرمایا: "غیبت کا طولانی ہونا، اے احمد۔"

عرض کی: "یا ابن رسول اللہ! اس بچے کی غیبت طولانی ہوگی؟"

امام = نے فرمایا: ہاں، خدا کی قسم ایسا ہی ہوگا۔ غیبت اتنی طولانی ہوگی کہ اکثر غیبت کے ماننے والے بھی انکار کرنے لگیں گے اور سوائے ان کے کوئی نہ بچے گا جن سے خداوند متعال ہماری ولایت کا اقرار لے چکا ہے اور جن کے دلوں میں ایمان کو لکھ دیا ہے اور اپنی روح کے ساتھ جن کی تائید فرمائی ہے۔ اے احمد بن اسحاق! یہ امر خدا میں

سے ایک امر، راز الٰہی میں سے ایک راز اور غیب خدا میں سے ایک غیب ہے۔

میں نے جو کچھ دیا ہے اسے لے لو اسے چھپا کر رکھو اور شاکرین میں سے ہو جاؤ تا کہ قیامت کے دن ہمارے ساتھ علیین میں سے ہو سکو۔"(۴۷)

۴۔ سنی اور شیعہ روایت کے مطابق آپ کا ظہور خانہ کعبہ سے ہوگا۔ آپ کے دائیں جبرائیل اور بائیں میکائیل ہوں گے۔ چونکہ جبرئیل [illegible] انسان [illegible] اور حضرت میکائیل [illegible] آپ کے اقوال [illegible] آپ [illegible] کی صورت [illegible] ہے(۴۸) اور ((له هيبة موسى و بهاء عيسى و حكم داؤد و صبر ايوب))(۴۹) امام علی رضا کی حدیث کے مطابق ایسے لباس میں ملبوس ہوں گے کہ ((عليه جيوب النور تتوقد من شعاع ضياء القدس))(۵۰)

۵۔ الغیبۃ میں شیخ طوسی اور صاحب عقد الدرر کی روایت کے مطابق آپ عاشور کے دن ظہور فرمائیں گے(۵۱) تا کہ ﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ﴾(۵۲) کی تفسیر ظاہر ہو۔ اور پاکیزہ خون سے آبیاری شدہ اسلام کا شجرہ طیبہ آپ کی برکت سے ثمر بخش بنے اور یہ آیت کریمہ ﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا﴾(۵۳) اپنے عالی ترین مصداق سے منطبق ہو۔

ممکن ہے کہ طول عمر، سادہ لوح افراد کے اذہان میں شبہات ایجاد کرنے کا سبب ہو لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ ایک انسان کی عمر کا ہزاروں سال تک طولانی ہونا، نہ تو عقلی طور پر محال ہے اور نہ ہی عادی اعتبار سے، کیونکہ محال عقلی یہ ہے کہ دو نقیضین کے اجتماع یا ارتفاع کا سبب ہو، مثال کے طور پر جیسا کہ ہم کہیں کہ کوئی بھی چیز یا ہے یا نہیں ہے: یا مثلاً عدد یا جفت ہے یا طاق، کہ ان کا اجتماع یا ارتفاع عقلاً محال ہے اور محال عادی یہ ہے کہ عقلی اعتبار سے تو ممکن ہو، لیکن قوانین طبیعت کے مخالف ہو مثال کے طور پر انسان آگ میں گر کر بھی نہ جلے۔

انسان کا ہزار ہا سال طول عمر پانا اور اس کے بدن کے خلیات کا جوان باقی رہنا نہ تو محال عقلی ہے اور نہ محال عادی، لہذا اگر حضرت نوح علی نبینا وآلہ وعلیہ السلام کی عمر اگر نو سو پچاس سال یا اس سے زیادہ واقع ہوئی ہے تو اس سے زیادہ بھی ممکن ہے اور سائنسدان اس کے بقاء حیات و نشاط جوانی کے راز کی جستجو میں تھے اور ہیں۔ جس طرح

علمی قوانین و قواعد کے ذریعے مختلف دھاتوں کے ذرات کی ترکیب میں تبدیلی سے انھیں آفات اور نابود ہونے سے بچایا جا سکتا ہے اور لوہے کو کہ جسے زنگ لگ جاتا ہے اور تیزاب جسے نابود کر دیتا ہے، آفت ناپذیر طلائے ناب بنایا جا سکتا ہے، اسی طرح علمی قوانین و قواعد کے ذریعے ایک انسان کی طولانی عمر بھی عقلی و عملی اعتبار سے ممکن ہے، چاہے ابھی تک اس راز سے پردے نہ اٹھے ہوں۔

اس بحث سے قطع نظر کہ امام زمانہ ۔ پر اعتقاد، خداوند متعال کی قدرت مطلقہ، انبیاء کی نبوت اور معجزات کے حق پر ایمان لانے کے بعد کا مرحلہ ہے، اسی لئے جو قدرت ابراہیم ۔ کے لئے آگ کو سرد اور سالم قرار دے سکتی ہے، جادوگروں کے جادو کو عصائے موسیٰ کے دہن کے ذریعے نابود کر سکتی ہے، مردوں کو عیسیٰ کے ذریعے زندہ کر سکتی ہے اور اصحاب کہف کو صدیوں تک بغیر کھائے پیئے نیند کی حالت میں باقی رکھ سکتی ہے، اس قدرت کے لئے ایک انسان کو ہزاروں سال تک جوانی کے نشاط کے ساتھ اس حکمت کے تحت سنبھال کر رکھنا نہایت ہی سہل اور آسان ہے کہ زمین پر حجت باقی رہے اور باطل پر حق کے غلبہ پانے کی حیثیت متحقق ہو کر رہے ﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ (۵۵)

اس واقعے کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ شہر ری میں شیخ صدوق کی قبر ٹوٹی اور آپ کے تر و تازہ بدن کے نمایاں ہونے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ آپ کے جسم پر قوانین طبیعت کا کوئی اثر نہیں ہوا اور بدن کو فاسد کرنے والے تمام اسباب و عوامل بے کار ہو کر رہ گئے۔ اگر طبیعت کا عمومی قانون امام زمانہ ۔ کی دعا سے پیدا ہونے والے شخص کے بارے میں ٹوٹ سکتا ہے، جس نے آپ ۔ کے عنوان سے "کمال الدین و تمام النعمۃ" جیسی کتاب لکھی ہے، تو خود اس امام ۔ کے بارے میں اس قانون کا ٹوٹنا جو نائب خدا اور تمام انبیاء و اوصیاء کا وارث ہے، باعث تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

شیخ الطائفہ اپنی کتاب "الغیبۃ" میں فرماتے ہیں: "غیبت کے زمانے میں آپ ۔ کی امامت کو ثابت کرنے والے معجزات قابل شمار نہیں ہیں" (۵۶)۔ اگر شیخ طوسی کے زمانے تک، جنہوں نے ۴۶۰ ہجری میں وفات پائی ہے، معجزات کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل تھا تو موجودہ زمانے تک معجزات میں کتنا اضافہ ہو چکا ہوگا!؟!

لیکن اس مقدمے میں ہم دو مشہور روایتیں پیش کرتے ہیں، جن کا ناقل علی بن عیسیٰ اربلی (۵۷) جو فریقین کے نزدیک ثقہ ہیں، ان کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ: "امام مہدی ۔ کے متعلق لوگ ما فوق العادۃ خبریں اور قصے نقل

کرتے ہیں جن کی شرح طولانی ہے۔ میں اپنے زمانے میں واقع ہونے والے دو واقعات، جنہیں میرے دوسرے ثقہ بھائیوں کے ایک گروہ نے بھی نقل کیا ہے، ذکر کرتا ہوں:

۱۔ حلہ میں فرات اور دجلہ کے درمیان آبادی میں اسماعیل بن حسن نامی شخص رہتا تھا، اس کی بائیں ران پر انسان کی مٹھی کے برابر پھوڑا نکل آیا۔ حلہ اور بغداد کے اطباء اسے دیکھنے کے بعد لاعلاج قرار دے چکے تھے۔ لہٰذا وہ سامرہ آ گیا اور دو ائمہ حضرت امام ہادی اور امام عسکری علیہما السلام کی زیارت کرنے کے بعد اس نے سرداب میں جا کر خدا کی بارگاہ میں دعا و گریہ وزاری کی اور امام زمانہ ؑ کی خدمت میں استغاثہ کیا، اس کے بعد دجلہ کی طرف جا کر غسل کیا اور لباس پہنا۔ مگر اس نے دیکھا کہ چار گھڑ سوار شہر کے دروازے سے باہر آئے۔ ان میں سے ایک بوڑھا تھا جس کے ہاتھ میں نیزہ تھا، ایک جوان رنگین قبا پہنے ہوئے تھا، وہ بوڑھا راستے کی دائیں جانب اور دوسرے دو جوان راستے کی بائیں جانب اور وہ جوان جس نے رنگین قبا پہن رکھی تھی ان کے درمیان راستے پر تھا۔

رنگین قبا والے نے پوچھا: "تم کل اپنے گھر روانہ ہو جاؤ گے؟"

میں نے کہا: "ہاں۔" اس نے کہا: "نزدیک آؤ، ذرا دیکھوں تو تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

اسماعیل آگے بڑھا، اس جوان نے اس پھوڑے کو ہاتھ سے دبایا اور دوبارہ زین پر سوار ہو گیا۔ بوڑھے نے کہا: "اے اسماعیل! تم فلاح پا گئے، یہ امام ؑ تھے۔"

وہ روانہ ہوئے تو اسماعیل بھی ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا، امام ؑ نے فرمایا: "پلٹ جاؤ۔"

اسماعیل نے کہا: "آپ سے ہرگز جدا نہیں ہوں گا۔" امام ؑ نے فرمایا: "تمہارے پلٹ جانے میں مصلحت ہے۔" اسماعیل نے دوبارہ کہا: "آپ سے ہرگز جدا نہیں ہو سکتا۔" بوڑھے نے کہا: "اسماعیل! تمہیں شرم نہیں آتی، دو مرتبہ امام ؑ نے فرمایا پلٹ جاؤ اور تم مخالفت کرتے ہو؟"

اسماعیل وہیں رک گیا، امام چند قدم آگے جانے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "جب بغداد پہنچو گے، ابو جعفر یعنی خلیفہ مستنصر باللہ، تمہیں طلب کرے گا۔ جب اس کے پاس جاؤ اور تمہیں کوئی چیز دے، اس سے نہ لینا اور ہمارے فرزند رضا سے کہنا علی بن عوض کو خط لکھیں، میں اس تک پیغام پہنچا دوں گا کہ جو تم چاہو گے تمہیں عطا کرے گا۔"

اس کے بعد اصحاب کے ساتھ روانہ ہو گئے اور نظروں سے اوجھل ہونے تک اسماعیل انہیں دیکھتا رہا۔ غم وحزن اور افسوس کے ساتھ کچھ دیر زمین پر بیٹھ کر ان سے جدائی پر روتا رہا۔ اس کے بعد سامرہ آیا تو لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو کر پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے، تم نے کس کا پیچھا کیا؟ کیوں جو ہاشمی سے گفتگو کر رہے تھے؟ ہم لوگوں نے شہر سے خارج ہونے والے سواروں کو دیکھا، وہ کون تھے؟ انہوں نے جواب دیا: وہ چار افراد تھے جو ... سے باہر نکل گئے تھے۔ ان میں سے ایک ... کے اصحاب تھے اور امام نے میرے زخم پر بیماری کی جگہ دست شفا پھیر دیا ہے۔

جب لوگوں نے دیکھا کہ زخم کی جگہ کوئی نشان تک باقی نہیں رہا تو ان کے لباس کو تبرک کے طور پر پھاڑ ڈالا۔ یہ خبر خلیفہ تک پہنچی۔ خلیفہ نے تحقیق کے لیے ایک شخص کو بھیجا۔

اسماعیل نے رات سرداب میں گزاری اور صبح کی نماز کے بعد لوگوں کے ہمراہ سامرا سے باہر آیا۔ لوگوں سے جدا ہونے کے بعد وہ چل دیا۔ جب قطر ... پہنچا تو اس نے دیکھا کہ لوگوں کا ہجوم جمع ہے اور ہر آنے والے سے اس کا نام و نسب پوچھ رہے ہیں۔ نشانیوں کی وجہ سے انہوں نے پہچاننے کے بعد لوگ بطور تبرک اس کا لباس پھاڑ کر لے گئے۔

تحقیق پر مامور شخص نے خلیفہ کو تمام واقعہ لکھا۔ اس خبر کی تصدیق کے لئے وزیر نے اسماعیل کے رضی الدین نامی ایک دوست کو طلب کیا۔ جب دوست نے اسماعیل کے پاس پہنچ کر دیکھا کہ اس کی ران پر پھوڑے کا اثر تک باقی نہیں ہے، وہ بے ہوش ہو گیا اور ہوش میں آنے کے بعد اسماعیل کو وزیر کے پاس لے گیا۔ وزیر نے اس کے معالج اطباء کو بلوایا اور جب انہوں نے بھی معائنہ کیا اور پھوڑے کا اثر تک نہ پایا تو کہنے لگے: ”یہ حضرت مسیح کا کام ہے“۔ وزیر نے کہا: ”ہم جانتے ہیں کہ کس کا کام ہے۔“

وزیر اسے خلیفہ کے پاس لے گیا، خلیفہ نے اس سے حقیقت حال کے متعلق پوچھا، جب واقعہ بیان کیا تو اسے ہزار دینار دیئے، اسماعیل نے کہا: میں ان سے ایک ذرے کو لینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ خلیفہ نے پوچھا: کس کا ڈر ہے؟ اس نے کہا: ”اس کا جس نے مجھے شفا دی ہے، اس نے مجھ سے کہا ہے کہ ابو جعفر سے کچھ نہ لینا۔“ یہ سن کر خلیفہ رونے لگا۔

علی بن عیسیٰ کہتے ہیں: میں یہ واقعہ کچھ لوگوں کے لئے نقل کر رہا تھا، اسماعیل کا فرزند شمس الدین بھی اس محفل میں

موجود تھا جسے میں نہیں پہچانتا تھا، اس نے کہا: "میں اس کا بیٹا ہوں۔" میں نے اس سے پوچھا: "کیا تم نے اپنے والد کی ران دیکھی تھی جب اس پر پھوڑا تھا؟" اس نے کہا: "میں اس وقت چھوٹا تھا لیکن اس واقعے کو اپنے والدین، رشتہ داروں اور ہمسایوں سے سنا ہے اور جب میں نے اپنے والد کی ران کو دیکھا تو زخم کی جگہ بال بھی آچکے تھے۔"

اور علی بن عیسیٰ کہتے ہیں: "ہم اسماعیل کے بیٹے سے ملاقات کر چکے ہیں کہ جس نے بتایا کہ میرے والد چالیس مرتبہ سامرا گئے کہ شاید دوبارہ ان کی زیارت کر سکیں۔"

اور علی بن عیسیٰ کہتے ہیں: "میرے لئے سید باقی بن عطوہ علوی حسنی نے حکایت بیان کی کہ ان کے والد عطوہ امام مہدی کے وجود مبارک پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور کہا کرتے تھے: "اگر آپ آئے اور مجھے بیماری سے شفا دے تو تصدیق کروں گا۔" اور مسلسل یہ بات کہا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ نماز عشاء کے وقت سب گھر والے جمع تھے کہ والد کے چیخنے کی آواز سنی، جلدی سے ان کے پاس گئے۔ انہوں نے کہا: "امام کی خدمت میں جلدی کرو ابھی ابھی میرے پاس سے باہر گئے ہیں۔"

باہر آئے تو ہمیں کوئی نظر نہیں آیا، دوبارہ والد کے پاس پلٹ کر آئے تو انہوں نے کہا: "ایک شخص میرے پاس آیا اور کہا: اے عطوہ، میں نے کہا: لبیک، اس نے کہا: میں ہوں مہدی، تمہیں اس بیماری سے شفا دینے آیا ہوں اس کے بعد اپنا دست مبارک بڑھا کر میری ران کو دبایا اور واپس چلے گئے۔"

اس واقعہ کے بعد عطوہ ہرن کی طرح چلتے تھے۔

زمانہ غیبت میں آپ- سے بہرہ مند ہونے کا طریقہ:

اگر چہ امام زمانہ- ہماری نظروں سے غائب ہیں اور اس غیبت کی وجہ سے امت اسلامی آپ- کے وجود کی ان برکات سے محروم ہے جو آپ- کے ظہور پر موقوف ہیں، لیکن بعض فیوضات ظہور سے وابستہ نہیں ہیں۔

آپ- کی مثال آفتاب کی سی ہے، کہ غیبت کے بادل پاکیزہ دلوں میں آپ- کے وجود کی تاثیر میں رکاوٹ نہیں بن سکتے، اسی طرح جیسے سورج کی شعاعوں سے اطاق زمین میں موجود قیمتی جواہر پروان چڑھتے ہیں اور سنگ و خاک کے ضخیم پردے اس گوہر کو آفتاب سے استفادہ کرنے سے نہیں روک سکتے۔

جیسا کہ خداوند متعال کے الطاف خاصہ سے بہرہ مند ہونا دو طریقوں سے میسر ہے۔

اول:۔ جہاد فی اللہ کے ذریعے، یعنی خدا کے نورِ عنایت کے انعکاس میں رکاوٹ بننے والی کدورتوں سے نفس کو پاک کرنے سے۔

دوم:۔ اضطرار کے ذریعے جو فطرت اور مبدء فیض کے درمیان موجود پردوں کو ہٹاتا ہے ﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَکْشِفُ السُّوْٓءَ﴾(۵۸)

اسی طرح فیضِ الٰہی کے وسیلے سے استفادہ کرنا جو اسمِ اعظم و مَثَلِ اعلیٰ ہے، دو طریقوں سے ممکن ہے:

اول:۔ فکری، اخلاقی اور عملی تزکیہ کر ((أما تعلمون أن أمرنا هذا لا ينال إلا بالورع))(۵۹)

دوم:۔ اضطرار اور اسباب مادی سے قطع تعلق کے ذریعے کہ اس طریقے سے بہت سے افراد جن کے لیے کوئی چارہ کار نہ بچا تھا اور جو بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گئے تھے، امام ؑ سے استغاثہ کرنے کے بعد نتیجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

آخر میں ہم ساحت مقدس امام زمانہ ؑ کے حضور میں اپنے قصور و تقصیر کا اعتراف کرتے ہیں۔ آپ ؑ وہ ہیں جن کے وسیلے سے خدا نے اپنے نور اور آپ ؑ ہی کے وجودِ مبارک سے اپنے کلمے کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے، کمالِ دین امامت سے ہے اور کمالِ امامت آپ ؑ سے ہے اور آپ ؑ کی ولادت کی شب یہ دعا وارد ہوئی ہے ((اللّٰهم بحق ليلتنا هذه ومولودها وحجتك وموعودها التي قرنت إلى فضلها فضلك، فتمت كلمتك صدقاً وعدلاً، لا مبدل لكلماتك ولا معقب لآياتك، ونورك المتألق وضياؤك المشرق والعلم النور في طخياء الديجور الغائب المستور جلّ مولده وكرم محتده، والملائكة شهده والله ناصره ومؤيده إذا آن ميعاده، والملائكة أمداده، سيف الله الذي لا ينبو، ونوره الذي لا يخبو، وذو الحلم الذي لا يصبو......))(۶۰)

فروع دین

اس مقدمے میں فروع دین کے اسرار اور حکمتوں کو بیان کرنے کی گنجائش نہیں، اس لئے کہ فروع دین انسان کے ذاتی اور اجتماعی احوال سے مربوط قوانین اور خالق و مخلوق کے ساتھ، اس کے رابطے کا نام ہے کہ اس سے متعلق فقہ کا ایک حصہ اڑتالیس ابواب پر مشتمل ہے، لیکن اس مجموعے میں سے ہم نماز و زکات کی حکمت کو مختصر طور پر بیان کرتے ہیں:

الف۔ نماز

نماز چند اجزاء، شرائط اور موانع پر مشتمل ہے ان میں سے بعض کی حکمت ذکر کرتے ہیں:

نماز ادا کرنے کی جگہ مباح ہونے کی شرط انسان کو متوجہ کرتی ہے کہ کسی کے حق سے تجاوز نہ کرے اور نماز میں نجاست سے پاک ہونے کی شرط اسے اس بات کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ پانی سے دھل جانے والی نجاست یا مثال کے طور پر روح کے آئینے میں بے اختیار جنابت سے پیدا ہونے والی کثافت، نماز کے باطل ہونے کا سبب اور ذوالجلال والاکرام کی بارگاہ میں جانے سے مانع ہے، لہٰذا جھوٹ، خیانت، ظلم، جنایت اور اخلاقی رذائل جیسے قبیح اعمال جو انسان کو حقیقت نماز سے محروم کرتے ہیں، جو مومن کی معراج ہے، کتنی بری تاثیر رکھتے ہوں گے۔

اذان، جو خدا کے حضور حاضر ہونے کا اعلان ہے اور اقامت جو مقام قرب کی طرف روح کی پرواز کے لیے ایک مقدماتی عمل ہے، معارف دین کا خلاصہ ہیں۔

اسلام کی تعلیم و تربیت بیان کرنے کے لئے فقط اذان و اقامت میں تامل اور غور ہی کافی ہے کہ ان دونوں میں تکبیر سے ابتداء اور تہلیل پر اختتام ہوتا ہے اور چونکہ تکبیر کی ابتداء اور تہلیل کی انتہا ((اللّٰہ)) ہے، لہٰذا اس مکتب نماز

سے نماز گزار یہ سیکھتا ہے کہ ﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ﴾(۱)

اذان و اقامت کی ابتداء و انتہاء میں لفظ ((اللّٰہ)) کا ہونا، بچے کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت اور تکبیر کے لئے کلمۂ توحید کی تلقین کا مستحب ہونا اس بات کا اعلان ہے کہ انسان کی زندگی کی ابتداء و انتہاء خدا کے نام پر ہونا چاہیے۔

تکبیر کے بعد ((لا الٰہ الا اللّٰہ)) کی دو بار تکرار اور بیچ جانے کے بعد آخر میں اس جملے کو تکرار کرنا انسان کے عمل اور اس کی زندگی کے کردار کی وضاحت کرتا ہے۔

کلمۂ توحید کے اعتبار سے اس جملے میں یہ خصوصیات موجود ہیں:

اس جملے کے حروف بھی وہی ہیں جو ((اللّٰہ)) والے حروف ہیں اور چونکہ اظہار کئے بغیر اسے زبان سے ادا کیا جا سکتا ہے لہٰذا اس میں ریا کاری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

نفی و اثبات پر مشتمل ہے، لہٰذا اس پر راسخ اعتقاد انسان کو اعتقادات، اخلاق اور اعمال میں باطل کی نفی اور اثبات حق تک پہنچاتا ہے اور حدیث سلسلۃ الذھب کے معانی آشکار و واضح ہوتے ہیں کہ ((کلمۃ لا الٰہ الا اللّٰہ حصنی فمن دخل حصنی امن من عذابی))(۲)

اور شریعت، رسول اکرم ﷺ کے بیان کی گہرائی کو درک کر سکتی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((قولوا لا الٰہ الا اللّٰہ تفلحوا))(۳) اور یہی نفی و اثبات ہیں جو انسان کی جان کو مرکز وجود کے جوہر سے متصل کر کے فلاح و رستگاری کے نور سے منور کرتے ہیں۔

((لا الٰہ الا اللّٰہ)) میں تدبر کے وسیلے سے، روح نماز گزار میں پاکیزگی آنے پر وہ اس مقام تک رسائی حاصل کر لیتا ہے کہ کہے: ﴿إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾(۴) اور فاطر السماوات والارض کی طرف توجہ کے ذریعے زمین و آسمان سے گزر کر، سات تکبیروں کی مدد سے سات حجابوں سے بھی گزر جاتا ہے اور ہاتھوں کو کانوں تک بلند کر کے خدا کے سوا باقی سب کو پیٹھ پیچھے ڈال دیتا ہے۔ اس کی ہر حد و وصف سے کبریائی کا اعلان کر کے اس کی عظمت کے سامنے سے اوہام و افکار کے پردے ہٹا دیتا ہے ((اللّٰہ اکبر من ان یوصف)) اور خدا سے کلام کے لئے تیار ہو جاتا ہے، کیونکہ نماز، خدا کے ساتھ انسان

کی گفتگو ہے اور قرآن، انسان کے ساتھ خدا کی گفتگو ہے۔ لیکن خدا کے ساتھ انسان کی گفتگو کلام خدا ہی سے شروع ہوتی ہے، اس لئے کہ انسان نے غیر خدا سے جو کچھ سیکھا ہے اس کے ذریعے خدا کی حمد و تعریف ممکن ہی نہیں ہے اور کلام خدا کی عزت و حرمت کی بدولت اس کی گفتگو سنے جانے کے قابل ہوتی ہے ((سمع اللہ لمن حمدہ))۔

((لا صلاۃ لہ الا ان یقرأ بھا))(۵) کے تقاضے کے مطابق نماز کا حمد پر مشتمل ہونا ضروری ہے اور جس طرح قرآن جو خالق کی مخلوق کے ساتھ گفتگو ہے، سورہ حمد سے شروع ہوا ہے، نماز بھی چونکہ مخلوق کی خالق کے ساتھ گفتگو ہے، سورہ حمد سے شروع ہوتی ہے۔

نماز گزار کے لئے ضروری ہے کہ وہ حمد و سورہ کو کلام خدا کی قرائت کی نیت سے پڑھے لیکن روح نماز، نماز کے اقوال و افعال میں موجود معانی، اشارات اور لطیف نکات کی طرف توجہ دینے سے حاصل ہوتی ہے، لہذا ہم سورہ حمد کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

اس سورہ مبارکہ میں مبدأ و معاد کی معرفت، اسماء و صفات خداوند متعال، خدا کا انسان اور انسان کا خدا سے عہد اور بعض روایات(۶) کے مطابق اس سورے میں اللہ کے اسم اعظم کو اجزاء میں تقسیم کر کے کو سمو دیا گیا ہے۔ اس سورہ مبارکہ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کا نصف یعنی ﴿مالک یوم الدین﴾ تک خدا کے لئے اور بقیہ حصہ یعنی ﴿اھدنا الصراط المستقیم﴾ سے آخر تک انسان کے لئے اور درمیانی آیت خدا و عبد کے درمیان اس طرح تقسیم ہوئی ہے کہ عبادت خدا کے لئے اور استعانت انسان کے لئے ہے۔

سورے کی ابتداء ((بسم اللہ)) سے ہے کہ صبح رسالت بھی اسی سے طلوع ہوئی تھی ﴿اقرأ باسم ربک﴾(۷)

اسم اللہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ وہ اسم ذات ہے جس میں تمام اسماء حسنیٰ جمع ہیں ﴿وللہ الاسماء الحسنی فادعوہ بھا﴾(۸)

اور اس سے مراد ایسا معبود ہے جس کے بارے میں مخلوق متحیر اور اس کی پناہ چاہتے ہیں ((عن علی -: اللہ معناہ المعبود الذی یالہ فیہ الخلق و یولہ الیہ))(۹) اور خدا کی نسبت انسان کے لئے جو کمال معرفت ممکن ہے وہ یہ ہے کہ اس کی معرفت کو نہ پاسکنے کا ادراک رکھتا ہو۔

((اللہ)) کی صفات ((رحمن و رحیم)) بیان کی گئی ہیں اس کی رحمت رحمانیہ و رحیمیہ کی شرح اس مقدمے میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ بس فقط یہ بات مورد توجہ رہے کہ خداوند متعال نے انسان سے اپنے کلام اور اپنے ساتھ انسان کے کلام کو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ سے شروع فرمایا، اس آسمانی جملے کو مسلمانوں کے قول وفعل کا سرچشمہ قرار دیا اور پانچ واجب نمازوں میں صبح وشام اس جملے کو تکرار کرنے کا حکم فرمایا ہے اور انسان کو یہ تعلیم دی کہ نظام آفرینش کا دارومدار رحمت پر ہے اور کتاب تکوین وتشریع رحمت سے شروع ہوتی ہے۔

اس کی رحمت رحمانیہ کی بارش ہر مومن وکافر اور متقی وفاجر پر ہوتی ہے۔ جس طرح اس کی رحمت رحیمیہ کی شعاع سے ہر پاک دل روشن ہوتا ہے ﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾(۱)

دین خدا، دین رحمت اور اس کا رسول ﴿رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ﴾(۲) ہے اور دین میں موجود حدود وتعزیرات بھی رحمت ہیں۔ یہ مطلب مراتب امر بہ معروف ونہی از منکر کے ذریعے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر پیکر اجتماع کا ایک عضو فرد و معاشرے کی مصلحت کے برخلاف عمل کرے یا فردی ونوعی فساد کا مرتکب ہو، تو سب سے پہلے ملائمت ونرمی کے ساتھ اس کے علاج کی کوشش کرنا ضروری ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ بن عمران ، تو معجزات کے ہوتے ہوئے جب فرعون جیسے طاغوت کے زمانے میں مبعوث ہوئے تو خداوند متعال نے آپ اور آپ کے بھائی ہارون کو حکم دیا کہ اس کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں کیونکہ بعثت کا مقصد تسلط وقدرت نہیں بلکہ تذکر، خشیت اور ہدایت ہے ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾(۳) اور جب تک طبابت کے ذریعے علاج ممکن ہو اس عضو کو نشتر نہیں لگانا چاہیے اور اگر دوا سے علاج ممکن نہ ہو تو معاشرے کے جسمانی نظام میں خلل ڈالنے والے فاسد مادے کو نشتر کے ذریعے نکال دینا چاہئے اور جہاں تک ممکن ہو اس عضو کی حفاظت ضروری ہے اور اگر نشتر کے ذریعے بھی اس کی اصلاح نہ ہو تو معاشرے کی سلامتی کے لئے اسے پیکر اجتماع سے جدا کردینا ضروری ہے۔

اسی لئے نظام تکوین اور قوانین دین کی تفسیر ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ہے۔ اس تعلیم وتربیت کے ساتھ خدا کے بندوں کے لئے ہر مسلمان کو رحمت کا پیام آور ہونا چاہیے۔

خدا کے نام سے شروع کرنے کے بعد نماز گذار ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ کے جملے کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ تمام تعریفیں خدا کے لئے ہیں، اس لئے کہ وہ رب العالمین ہے اور ہر کمال وجمال اسی کی تربیت کا مظہر ہے۔

یہ جملہ کہتے وقت اس کی ربوبیت کے آثار کو اپنے وجود اور کائنات میں دیکھنے کے بعد، آسمان، زمین، جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان، تمام تعریفوں کو فقط اسی کی ذات سے منسوب کرتے ہیں۔ اور چونکہ پست ترین موجودات سے لے کر کائنات کے اعلیٰ ترین وجود تک میں، خدا کی تربیت کے آثار اس کی عمومی و خصوصی رحمت کا ظہور ہیں، لہذا دوبارہ ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کو اپنی زبان پر جاری کرتا ہے۔

فضل و رحمتِ خدا میں مستغرق ہوتے ہوئے اس غرض سے کہ کہیں عدلِ خدا سے غافل نہ ہو جائے کہتا ہے: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ اس لئے کہ معصیت، خدا کی ہتک حرمت ہے اور لامتناہی عظمت کی حرمت لامتناہی ہوتی ہے اور لامتناہی کی ہتک حرمت کسی بھی ہتک حرمت کے ساتھ قابل قیاس نہیں ہے اور انسان کے بارے میں جس ہستی کے حق اور نعمتوں کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، اس ہستی کی نافرمانی کی سزا بھی اس عمل کے تناسب سے ہوگی۔

اور ہر گناہ میں صرف ہونے والی قوت و قدرت اسی دنیا سے حاصل شدہ ہے، اس لئے کہ انسان کی زندگی اس دنیا سے وابستہ ہے۔ انسان جو گناہ انجام دیتا ہے وہ زمین و آسمان کی نعمتوں کے ساتھ خیانت ہے اور اسے حساب و کتاب اور روز جزاء در پیش ہیں، کہ خدا نے فرمایا ہے ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَ مَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَ لٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ﴾(۱۳) اسی لئے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ پر توجہ عرفاء کو لرزہ براندام کر دیتی ہے، کہ امام العارفین حضرت زین العابدین ‎ جب اس جملے پر پہنچتے تھے تو اتنا دہراتے تھے کہ ((كَادَ اَنْ يَمُوْتَ))(۱۴)

﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ اور ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ نماز گزار کو خوف و رجا کے بال و پر عطا کرتے اور خدا کی رحمت و عزت سے آشنا کرتے ہیں: پہلے جملے میں انسان کی نظر مغفرت و ثواب اور دوسرے جملے میں سزا و عتاب پر ہوتی ہے۔

اور اس وقت الوہیت، ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت، فضل اور عدل خدا کی عظمت اس کے دل کو تسخیر کر لیتی ہیں اور وہ صیغۂ غائب سے خطاب کی طرف اس ادراک کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، لہذا کہتا ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ اور اس توجہ کے ساتھ کہ یہ عبادت بھی اسی کی ہدایت اور حول و قوت سے ہے،

کہتا ہے: ﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾۔

﴿نَعْبُدُ﴾ میں دیکھتا ہے کہ عبادت عبد کی جانب سے ہے اور ﴿نَسْتَعِينُ﴾ میں اسے نظر آتا ہے کہ مدد خدا کی جانب سے ہے کہ ((لاحول ولاقوۃ الا باللہ))

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ میں نظریۂ جبر اور ﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ میں نظریۂ تفویض کی نفی ہے اور انہیں اس طرح جیسے ہیچ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے تا کہ خود کو مسلمانوں سے جدا نہ کرے اور ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ میں کلمۂ توحید اور توحید کلمہ، دونوں کو جامۂ عمل پہناتا ہے۔

فریضۂ عبودیت انجام دینے کے بعد عبد کی مولا سے دعا و درخواست کی باری ہے، لہذا کہتا ہے: ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾، انسانیت کی علامت اور الوہیت کے جلال و اکرام کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے قیمتی ترین گوہر کی درخواست کی جائے اور وہ گوہر صراط مستقیم کی ہدایت ہے جو ہر طرح کی افراط و تفریط سے دور ہے اور راہ مستقیم متعدد نہیں ہیں۔ خدا ایک ہے اور اس کی راہ بھی ایک اور اس راستے کی ابتداء انسان کے نقطۂ نقص سے ہوتی ہے ﴿وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا﴾(۱۵) اور کمال مطلق اس کی انتہا قرار پاتی ہے کہ ((ماذا وجد من فقدک، وماالذی فقدمن وجدک))(۱۶) اور ﴿وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ﴾(۱۷)

﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ راہ مستقیم ان کا راستہ ہے جن پر خداوند عالم نے اپنی نعمتیں نازل فرمائی ہیں ﴿وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا﴾(۱۸)

مسلمان اپنے خدا سے انبیاء، مرسلین، شہداء اور صدیقین کی صف میں شامل ہونے کی دعا اور غضب الہی میں گرفتار و گمراہ لوگوں سے دوری کی درخواست کرتا ہے۔ اس دعا کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان خود کو اخلاق انبیاء سے آراستہ اور اہل غضب و ضلال کے رویے سے اجتناب کرے اور ﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾(۱۹) کا تقاضا یہ ہے کہ ذات قدس جو ﴿نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾(۲۰) ہے کی طرف متوجہ رہے اور حقیقت ایمان سے منور دل کی آنکھوں سے اس کی عظمت کو جانے اور حکم ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ﴾(۲۱) کو بجالاتے ہوئے اس کے سامنے سر تسلیم خم کرے اور کہے ((سبحان ربی العظیم و بحمدہ))

رکوع سے سر اٹھائے اور سجدے کے ذریعے حاصل ہونے والے مقام قرب کے لئے تیار ہو اور حکم ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْأَعْلَی﴾(۲۲) کی اطاعت کرتے ہوئے خاک پر سجدہ ریز ہو جائے اور پیشانی خاک پر رکھ کر اس عنایت کو یاد کرے کہ اس ناچیز خاک سے خلق کرنے کے باوجود اس کے دل کو چراغ عقل سے روشن و منور فرمایا، خاک پر سر رکھنے سے ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِینٍ﴾(۲۳) پر نظر کرے اور کہے ((سبحان ربی الاعلیٰ وبحمده)) اور سر اٹھاتے وقت ﴿ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ فَتَبَارَکَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِینَ﴾(۲۳) اور اپنی حیات دنیوی پر نظر ڈالے اور کہے ((اللّٰه اکبر))۔ دوبارہ خاک پر گر کر اس دن کو یاد کرے جب اس کی منزل اس تاریک و اندھیری خاک میں ہوگی۔ زندگی کے بعد موت پر نظر کرے اور دوبارہ سر اٹھا کر موت کے بعد کی زندگی کو دیکھے اور دو سجدوں میں ﴿مِنْهَا خَلَقْنَاکُمْ وَ فِیهَا نُعِیدُکُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُکُمْ تَارَةً أُخْرَی﴾(۲۵) کے معنی کو سمجھے اور اپنے وجود کے مراحل کی معرفت کو طے کرے۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ نماز میں موجود حکمت و ہدایت کے انوار خورشید میں سے ایک شعاع کی مانند ہے اور سورہ حمد کے بعد پڑھی جانے والی سورہ، اذکار، قیام، قعود، قنوت، تسبیحات اربعہ، تشہد، سلام اور آداب نماز کے اسرار کو اختصار کی غرض سے بیان نہیں کیا گیا ہے۔

یہ تھا اسلام میں عبادت کا نمونہ، اس کے مدمقابل عیسائیوں کی عبادت یہ ہے: ''اور عبادت کرتے ہوئے سابقہ امتوں کی طرح بے کار میں تکرار نہ کرو، چونکہ وہ گمان کرتے تھے کہ زیادہ کہنے کے سبب ان کی عبادت قبول ہوگی، پس ان کی طرح نہ ہونا، کیونکہ تمہارا باپ، اس سے پہلے کہ تم سوال کرو، تمہاری حاجات سے واقف ہے، پس تم اس طرح سے دعا مانگو: اے ہمارے پدر! کہ تیرا نام آسمان پر مقدس رہے۔ تیرا ملکوت آجائے، جس طرح تیرا ارادہ آسمان میں ہے زمین میں ویسے انجام پائے۔ ہمیں آج کے دن کافی ہو جانے والی روٹی دے دے اور ہمارے قرضے معاف فرما دے جیسا کہ ہم بھی اپنے قرض داروں کو بخش دیتے ہیں۔ ہمیں امتحان میں نہ ڈال، بلکہ ہمیں شریر سے نجات دے، کیونکہ ملکوت، قوت و جلال ابدالآباد تک تیرے لئے ہے۔ آمین''(۲۶)

ہم اس عبادت میں بعض نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ ''اے ہمارے پدر!'' خدا پر باپ کا اطلاق یا حقیقی ہے یا مجازی، اگر حقیقی ہو تو خدا کو تولید کی نسبت دینا،

درحقیقت اس کے لئے مخلوق کی صفت ثابت کرنا اور خالق کو مخلوق تصور کرنا ہے اور اگر مجازی ہو تو تشبیہ ہے اور خالق کی مخلوق سے تشبیہ، مخلوق کی صفت کو خالق کے لئے ثابت کرنا ہے۔ اور ایسی عبادت مخلوق کے لئے ہو سکتی ہے، خالق کی نہیں۔

جبکہ اسلام میں عبادت، ایسے خداوند متعال کی عبادت ہے جس کی معرفت سے عقول کو رہائی نہیں اور غیر سے تشبیہ دینے کی اجازت نہیں ہے۔

۲۔ ثناء پروردگار کے بعد ان کی خدا سے درخواست، اس دن کفایت کرنے والی روٹی ہے۔ عیسائی نماز میں پیٹ کی روٹی چاہتا ہے کہ جو انسان کے جسم کے لئے ایسے ہی ہے جیسے حیوان کے لئے گھاس۔ جب کہ مسلمان، صراط مستقیم کی ہدایت جیسی پسندیدہ راہ کی درخواست کرتا ہے، جو عقل کی آنکھ کا نور اور جس کا مقصد خدا ہے، کہ نہ تو ہدایت سے بڑھ کر، کہ جو کمال انسانیت ہے، کوئی قیمتی گوہر ہے. اور نہ ہی خداوند عز و جل سے بڑھ کر کوئی موجود ہے۔

۳۔ ''ہمارے قرض معاف فرما دے، جیسا کہ ہم اپنے قرض داروں کو بخش دیتے ہیں۔'' جھوٹ، خدا کی نافرمانی ومعصیت ہے اور معصیت کے ساتھ عبادت کرنا ممکن نہیں، کیا عیسائی اپنے قرض داروں کا قرضہ معاف کرتے ہیں جو اپنے خدا سے اس طرح کہتے ہیں؟!

اختصار کے پیش نظر، بقیہ ادیان کی عبادتوں کے ساتھ مقایسے سے صرف نظر کرتے ہیں۔

ب۔ زکات:

نماز انسان کا خالق سے اور زکات انسان کا مخلوق سے رابطہ ہے۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں زکات کا تذکرہ نماز کے ساتھ کیا گیا ہے ((عن ابی جعفر و ابی عبداللہ علیھما السلام قالا: فرض اللہ الزکاۃ مع الصلاۃ))(۲۷)۔

انسان مدنی الطبع ہے۔ مال، مقام، علم و کمال میں سے جو کچھ بھی اس کے پاس ہے، سب معاشرتی روابط کی بدولت ہے اور کیونکہ جس معاشرے میں زندگی بسر کر رہا ہے وہ اس کی مادی و معنوی کمائی میں حقدار ہے، لہذا ضروری ہے کہ معاشرے کا قرض ادا کرے۔

اور اسلام کے زکات وصدقات سے متعلق قوانین پر عمل کے ذریعے، ہر فرد معاشرے کا قرض ادا کرسکتا ہے۔

اسلام میں زکات، صدقات و انفاقات کا سلسلہ اتنا وسیع ہے کہ اگر اس پر صحیح عمل ہو تو معاشرے میں کوئی ضرورت مند باقی نہ رہے، جس کے نتیجے میں دنیا آباد ہو جائے اور ضرورت مندوں و بھوکوں کی سرکشی وطغیان کے وجود سے مطمئن ہوکر امن وامان کے تمدن کا گہوارہ بن جائے۔

امام جعفر صادق - فرماتے ہیں: ((إن اللّٰه عزوجل فرض للفقراء فی مال الأغنياء مايسعهم، ولوعلم ان ذلک لايسعهم لزادهم انهم لم يؤتوا من قبل فريضة اللّٰه عزّوجلّ لكن أوتوا من منع من منعهم حقهم لا ممّا فرض اللّٰه لهم ولوانّ الناس اَدّواحقوقهم لكانوا عائشين بخير))(۲۸)

اور محتاجوں کو نہ ملنے کے مفسدہ کی اہمیت کے پیش نظر فرمایا ﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلاَ يُنْفِقُوْنَهَا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾(۲۹)

عطا وبخشش کے اثر کے ذریعے معاشرے سے فقر کی بنیادوں کو نابود کرنے، انسان کے سخاوت وکرم سے آراستہ ہونے اور فرد ومعاشرے کی سعادت میں اس کے کردار کی اہمیت کے باعث رسول اکرم ﷺ نے سخاوت مند مشرک کو امان عطا کر دی(۳۰) اور اسی سخاوت کی بدولت اسے اسلام کی ہدایت نصیب ہوئی۔ روایت میں ہے کہ حضرت موسیٰ -کو پروردگار عالم نے وحی فرمائی کہ سامری کو قتل نہ کرو(۳۱) کیونکہ وہ سخاوتمند ہے۔

فقراء کی دیکھ بھال کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ کسی فقیر کو پیٹ بھر کر کھلانے، لباس پہنانے اور ایک خاندان کو سوال کی شرمندگی سے بچا کر ان کی آبرو کی حفاظت کرنے کو ستر بار حج بیت اللہ سے افضل قرار دیا گیا ہے۔(۳۲)

صدقہ واحسان کا دائرہ اتنا زیادہ وسیع ہے کہ امام محمد باقر - نے فرمایا:((إن اللّٰه تبارک و تعالیٰ يحب إبراد الكبدالحرّى و من سقى كبداً حرّى من بهيمة وغيرها اظله اللّٰه يوم لاظل إلاظله))(۳۳)۔

اسلام میں صدقات کے آداب معین ہیں۔ ان میں سے ایک ادب، صدقے کو چھپا کر دینا ہے، تاکہ صدقہ لینے والے کی حیثیت وآبرو محفوظ رہے،(۳۴) جتنا بھی زیادہ ہو اسے کم جانے(۳۵) کیونکہ صدقہ واحسان جتنا بھی زیادہ ہو، لینے والا ان سے زیادہ بڑا ہے(۳۶)۔

اس پر احسان نہ جتائے(۳۷) بلکہ اس کا شکر گذار ہو کہ وہ اس کے مال وجان کی طہارت کا وسیلہ بنا ہے۔ اس کے

سوال و درخواست کرنے سے پہلے عطا کرنے میں جلدی کرے، کہ امام جعفر صادق -فرماتے ہیں: ''کسی کے سوال کرنے کے بعد جو تم نے اسے عطا کیا ہے وہ اس کی عزت و آبرو کے مقابلے میں ہے۔'' (۳۸)، اپنے چہرے کو اس سے مخفی رکھے (۳۹) صدقہ لینے والے سے التماس دعا کہے (۴۰) اور جس ہاتھ میں صدقہ دے اس ہاتھ کا بوسہ لے اس لئے کہ بظاہر لینے والے کو صدقہ دے رہا ہے اور حقیقت میں لینے والا خدا ہے (۴۱) ﴿أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَ يَأْخُذُ الصَّدَقَاتِ﴾ (۴۲)

اور ضرورتمندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اتنی توجہ کی کہ ایثار کا دروازہ کھول دیا اور ارشاد ہوا: ﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (۴۳) اور ایثار کو کمال کے اس درجے تک پہنچاتے ہوئے کہ جس کے بعد کوئی اور درجہ قابل تصور نہیں، فرمایا: ﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَ أَسِيرًا ۞ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا﴾ (۴۴)

دین اسلام نے انفاق و صدقے کو فقط مال تک محدود نہیں کیا بلکہ کمزور کی مدد اور نابینا کی راہنمائی کو بھی صدقہ قرار دیا ہے۔ اعتبار و حیثیت کی بدولت کسی کی مشکلات حل کرنے کو جاہ و مقام کی زکات قرار دیا۔ فقط حوائج مادی پوری کرنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ فرمایا: ﴿وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ﴾ (۴۵) اور ہر وہ چیز انسان کا رزق ہے جس پر زندگی کا دارومدار ہو اسی لئے فرمایا: ((و ممّا علمناهم يبثون)) (۴۶)۔

جو کچھ بیان کیا گیا وہ زکات و صدقات سے متعلق مختصر طور پر اسلام کی حکمت کا تذکرہ تھا۔ اسلام نے اس مقدس قانون کے ذریعے اغنیاء کے نفوس کو بخل، حرص اور طمع کی کدورت اور زنگ سے بچایا اور ان کے اموال کو فقراء کے حقوق، جو ان کے خون کے مترادف ہیں، کی آلودگی سے پاک کیا۔ اور اس طرح سے غنی و فقیر کے رشتے کو مستحکم کیا اور ان دو طبقات، جن سے معاشرے کا بنیادی ڈھانچہ تشکیل پاتا ہے، کے درمیان تمام فاصلے مٹا کر کدورت کو الفت میں تبدیل کر دیا اور ان قوانین و آداب کی برکت سے نہ صرف یہ کہ ضرورت مندوں کی حاجات کو پورا کیا بلکہ ان کی عزت نفس، آبرو، شرافت اور عظمت انسانی کی حفاظت فرمائی۔

غنی کو بخشش، کے بعد فقراء کا احسانمند اور شکر گذار ہونے کا حکم، ایسی باران رحمت کی مانند ہے جس کے ذریعے خداوند تعالی نے فقراء کی آتش حسد کو بجھایا، اموال اغنیاء کو، جن کا معاشرے کی رگوں میں خون کی مانند دوڑنا ضروری

ہے تاکہ امت کے معاشی نظام کی حفاظت ہوتی رہے، زکات وصدقات کے حصار میں بیمہ کر دیا۔ امیرالمومنین - فرماتے ہیں:((و حصنوا أموالکم بالزکاۃ))(۲۷)

کیا اغنیاء کے مال اور دانشوروں کے علم کی اس کمیت وکیفیت کے ساتھ عطا وبخشش کے ذریعے معاشرے سے مادی ومعنوی فقر کی بنیادوں کو نہیں ڈھایا جاسکتا؟!

یہ فرد ومعاشرے کی سعادت کے لئے نماز وزکات کی حکمت واثر کا نمونہ تھا۔ لہذا جس دین نے ہر حرکت وسکون اور فعل وترک میں انسان کی کچھ ذمہ داریاں معیّن کی ہوں جو واجبات، محرمات، مستحبات، مکروہات اور مباحات کے مجموعے کو تشکیل دیتی ہیں اور افراد کی جان، عزت وآبرو اور مال کی حفاظت کے لئے جو قوانین، حقوق اور حدود معیّن کئے گئے ہیں، ان پر عمل کرنے سے کیسا مدینہ فاضلہ تشکیل پا سکتا ہے؟

مثال کے طور پر وہ حیوان جس سے انسان کام لیتا ہے، اس کے حقوق کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح وروشن ہو جاتی ہے کہ اس دین مبین میں انسانی حقوق کی کس طرح ضمانت دی گئی ہے۔

جس جانور پر انسان سوار ہوتا ہے، اس کے حقوق یہ ہیں: منزل پر پہنچنے کے بعد، اپنے کھانے کا انتظام کرنے سے پہلے، اس کے لئے چارہ مہیا کرے، جب کہیں پانی کے پاس سے گزرے اسے پانی پلائے تاکہ پیاسا نہ رہے، اس کے منہ پر تازیانہ نہ مارے، اس کی پیٹھ پر میدان جہاد میں ضرورت کے وقت کے علاوہ، کھڑا نہ ہو، اس کی طاقت سے زیادہ سنگین وزن نہ لادے اور کامِ نہ لے، اسے بُرا بھلا نہ کہے، اس کے چہرے کو بدصورت نہ بنائے، خشک زمین پر تیز اور علف زار میں آہستہ چلائے اور اس کی پیٹھ پر گفتگو کی محفل نہ جمائے۔

اور اگر دریا کے کنارے دسترخوان لگائے، باقی بچنے والی غذا کو پانی میں ڈال دے تاکہ دریائی جانور اس کی ہمسائیگی سے بے بہرہ نہ رہیں۔

اور جس زمانے میں پانی میں موجود خوردبین سے نظر آنے والے جانداروں کی کسی کو خبر تک نہ تھی، حکم دیا کہ پانی میں پیشاب نہ کریں کہ پانی کی بھی کچھ مخلوق ہے۔

حیوانات کے بعض حقوق اور ان کے بارے میں انسانی ذمہ داریوں کو ذکر کیا گیا، جس سے اجتماعی عدالت اور انسانی حقوق کے سلسلے میں دین اسلام کا آئین واضح ہوتا ہے۔

دینِ اسلام کا مقصد دنیا و آخرت کو آباد کرنا اور انسان کے جسم و جان کو قوت و سلامتی عطا کرنا ہے ﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾(۴۸)

دنیا و آخرت اور جسم و روح کی ایک دوسرے سے وابستگی اور عدل و حکمت کے تقاضے کے مطابق انسان کی مادی و معنوی زندگی میں سے ہر زندگی کی جتنی اہمیت و ارزش تھی، اتنی ہی اس کی جانب توجہ دلائی اور فرمایا: ﴿وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾(۴۹)

دنیا کو آباد کرنے اور انسان کی آسودگی و آرام پر مکمل توجہ رکھی، دنیا و آخرت کو ان کی خلقت کے تقاضے کے مطابق بالترتیب ثانوی و طفیلی اور بنیادی و مرکزی حیثیت دیتے ہوئے، دنیا و آخرت میں نیکی و حسنات کو انسان کی درخواست اور دعا قرار دیا کہ کلام امام معصوم - میں دنیا کے حسنہ کو رزق و معاش میں وسعت اور حسنِ خلق، جبکہ آخرت کے حسنہ کو رضوان خدا و بہشت بتلایا گیا ہے۔ اقتصادی ترقی بالخصوص زراعت و تجارت کو اہمیت دی اور ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ﴾(۵۰) کے حکم کے مطابق مؤمن کو سخاوت اور بے نیازی کی بدولت عزیز جانا۔ امام جعفر صادق - سے روایت نقل ہوئی ہے: ((و ما فی الأعمال شئ أحب إلی اللّٰه من الزراعة))(۵۱)۔ امیرالمومنین علی بن ابی طالب - نخلستان میں کاشتکاری و آبیاری کیا کرتے تھے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ امام جعفر صادق -نے بازار سے کنارہ گیری کرنے والے سے فرمایا: ((اغدا إلی عزّک))(۵۲) اور ایک روایت میں امیرالمومنین - فرماتے ہیں: ((تعرضوا للتجارات))(۵۳)

اسلام میں بازار و تجارت کی بنیاد ہوشیاری، امانت، عقل، درایت اور احکام تجارت کا خیال رکھنے پر ہے((لایقعدن فی السوق إلا من یعقل الشراء و البیع))(۵۴)((الفقه ثم المتجر))(۵۵)

لین دین کے لئے اسلام میں واجبات و مستحبات اور محرمات و مکروہات مقرر کئے گئے ہیں، یہاں ان کی تفصیل ذکر کرنا تو ممکن نہیں ہے، البتہ ان میں سے چند ایک کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

ہر قسم کے لین دین میں سود، قسم کھانا، بیچنے والے کا اپنی چیز کی تعریف کرنا، خریدار کا خریدی جانے والی چیز میں عیب نکالنا، عیب کو چھپانا، دھوکہ دینا اور ملاوٹ کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

تاجر کو چاہیے کہ حق دے اور حق لے، خیانت نہ کرے۔ اگر مدمقابل پشیمان ہو تو سودا کالعدم کردے اور اگر

تنگدستی ومشکل میں گرفتار ہو جائے تو اسے مہلت دے، اگر کوئی شخص کسی چیز کے خریدنے کو کہے جو کچھ اس کے پاس ہو اس سے اسے نہ بیچے، اور اگر کسی چیز کے فروخت کرنے کو کہے اسے اپنے لئے نہ خریدے، ترازو ہاتھ میں لینے والا کم لے اور زیادہ دے، چاہے اس کی نیت یہ ہو کہ اپنے فائدے سے کچھ کم یا زیادہ نہ کرے۔ اپنی گفتار میں سچے تاجر کے علاوہ باقی سب تاجر، فاجر ہیں۔

اور جس سے یہ کہے: ''سودے اور لین دین میں تم سے احسان واچھائی کروں گا'' اس سے منافع نہ لے، کسی رابطے کا خیال کئے بغیر تمام خریداروں کو برابر سمجھے اور جس چیز کی قیمت معلوم ومعین ہو، قیمت کم کروانے والے اور خاموش شخص کو ایک ہی قیمت پر بیچے، حساب اور لکھنا جانتا ہو کہ حساب اور لکھائی سیکھے بغیر سودا نہ کرے، لوگوں کو جس چیز کی ضرورت ہے اسے ذخیرہ نہ کرے، لین دین میں نرمی سے پیش آئے، آسانی کے ساتھ خرید وفروخت کرے، سہولت کے ساتھ لوگوں کو ان کا حق دے اور ان سے اپنا حق لے، مقروض پر سختی نہ کرے، لین دین طے ہونے کے بعد قیمت کم کرنے کو نہ کہے، مؤذن کی آواز سن کر بازار سے مسجد کی طرف جانے میں جلدی کرے، اپنے دل کو ذکر خدا کے ذریعے صفا عطا کرے اور نماز کے ذریعے عالم طبیعت سے ماوراء طبیعت کی جانب پرواز کرے ﴿فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ یُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ۞ رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِیْتَآءِ الزَّكٰوةِ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ﴾(۵۶)

اگر چہ اسلام کی تعلیم وتربیت کے معجزانہ اثرات کی تلاش وجستجو، قرآن کی تمام آیات اور سنت اہل بیت عصمت وطہارت علیہم السلام میں کرنا ضروری ہے، لیکن چونکہ آفتاب قرآن وسنت کی ہر شعاع، علم وہدایت کے نور کا مرکز وسرچشمہ ہے، لہذا سورہ فرقان کی آخری آیات اور تین احادیث کو ذکر کرتے ہیں، جو اس مکتب سے تربیت یافتہ افراد کی عکاسی کرتی ہیں:

آیات

﴿وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۞ وَ

أَلَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا ٭ وَّ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ
غَرَامًا ٭ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ٭ وَّ الَّذِيْنَ إِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ
قَوَامًا ٭ وَّ الَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ وَ لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا
يَزْنُوْنَ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا ٭ يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ يَخْلُدْ فِيْهِ مُهَانًا ٭ إِلَّا مَنْ
تَابَ وَ آمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولٰئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَّ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ٭
وَّ مَنْ تَابَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوْبُ إِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ٭ وَّ الَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَ إِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ
مَرُّوْا كِرَامًا ٭ وَّ الَّذِيْنَ إِذَا ذُكِّرُوْا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا ٭ وَّ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا ٭ أُولٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا
صَبَرُوْا وَ يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلَامًا ٭ خَالِدِيْنَ فِيْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا﴾(۵۷)

خداوند رحمان جس کی رحمت واسعہ سے ہر متقی و فاجر فیض یاب ہو رہا ہے، کی بندگی کا اثر یہ ہے کہ عبادالرحمٰن کا زمین پر چلنا، جو ان کے اخلاق کا آئینہ دار ہے، نہ تو اکڑ کے ساتھ ہے اور نہ ہی اس میں تکبر ہے۔

عبادالرحمٰن وہ لوگ ہیں جو خدا کے سامنے ذلیل اور مخلوق کے مقابل متواضع ہیں۔ نہ صرف یہ کہ کسی کو اذیت نہیں پہنچاتے بلکہ دوسروں کی تکالیف کو بھی برداشت کرتے ہیں اور جہل و نادانی سے بات کرنے والوں کے ساتھ جیسے کو تیسا کے بجائے نہ صرف یہ کہ اپنے حلم و بردباری کی بدولت ان سے جھگڑا نہیں کرتے بلکہ ان کے لئے جہالت کی بیماری سے نجات کی بھی آرزو کرتے ہیں﴿وَ إِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا﴾

اجنبیوں اور مخالفین کے ساتھ جن کا رویہ سلام وسلامتی ہے، ان سے اپنوں اور موافق افراد کے ساتھ مواسات و ایثار کے علاوہ کوئی اور امید نہیں کی جاسکتی۔

یہ تو دن میں ان کی رفتار و کردار ہے اور رات میں ان کا طریقہ یہ ہے کہ آفاق آسمان پر نظریں جما کر ستاروں اور کہکشاؤں میں موجود، خداوند متعال کے علم وقدرت اور حکمت کی نشانیوں میں تدبر وتفکر کرتے ہیں اور ان آیات ونشانیوں میں خداوند متعال کی تجلی کی عظمت کو دیکھ کر، رات قیام وسجود میں گزار دیتے ہیں ﴿يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا﴾ اور جب غور سے دیکھتے ہیں کہ کروڑوں ستارے اس کے حکم کے مطابق حرکت کر رہے ہیں اور اپنے مدار سے

نہیں کرتے اور عقل کو بروئے کار لاکر ترقی و اصلاح کرنے سے کہیں زیادہ اپنے جہل کے ذریعہ تباہی پھیلاتے ہیں، اگر اس کی عقل کو متین پاؤ پھر بھی دھوکہ نہ کھانا بلکہ عقل و ہوائے نفس کے درمیان مقابلے کے وقت دیکھو کہ آیا عقل کے برخلاف ہونے کا ساتھ دیتا ہے یا ہوئ کے خلاف عقل کا ساتھ دیتا ہے، جاہ طلبی کا کتنا رسیا ہے کیونکہ لوگوں میں بہت سے افراد ایسے ہیں جو دنیا کی خاطر تارک دنیا ہیں۔(۱۰)

نتیجہ یہ ہوا کہ کمال کا معیار فریب دینے والی باتیں اور متواضعانہ اعمال، مال وشکم اور دامن کی شہوت کو ترک کرنا نہیں ہے بلکہ کمال کا معیار وہ عقل ہے جو جہالت کی کدورت سے پاک ہوکر صلاح و اصلاح کا مبدأ و سرچشمہ قرار پائے اور وہ ہوئ ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام اور فرمان کے تابع ہو کہ جسے کوئی بھی ہوس حتی شہوت جاہ و مقام اسے فریب نہ دے سکے اور باطل کی ہمراہی میں ملنے والی عزت کو ٹھکراتے ہوئے، حق کے سائے میں ملنے والی ذلت کو گلے لگائے۔

۳۔ عنوان بصری جس کی زندگی کے چورانویں سال گذر چکے تھے اور سالہا سال سے مالکی مذہب کے امام، مالک ابن انس، کے پاس تحصیل علم کے لئے جس کی آمد ورفت تھی۔ چھٹے امام - کے مدینہ تشریف لانے پر اس نے آپ سے کسب علم کی درخواست کی، حضرت امام صادق - نے فرمایا: ”میں ایک مطلوب فرد ہوں، کہ میری طلب میں ہیں، اور اس کے باوجود رات ودن کی ہر گھڑی میں اوراد و اذکار میں مشغول ہوں“۔

یہ جواب سن کر عنوان نہایت غمگین ہوا، رسول خدا ﷺ کے روضہ اقدس پر حاضری دی اور دو رکعت نماز پڑھ کر امام - کے قلب کو اپنی طرف معطوف کرنے اور آپ کے علم سے بہرہ مند ہوکر خدا کی راہ مستقیم کی جانب ہدایت کے لئے دعا کی اور اسی غمگین حالت میں گھر لوٹ آیا۔ دل آپ - کی محبت میں اسیر تھا، تحصیل علم کے لئے مالک کے پاس جانا بھی چھوڑ دیا اور واجب نماز ادا کرنے کے علاوہ گھر سے باہر نہ آتا تھا۔

جب صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو ایک دن نماز عصر کے بعد آپ - کے دروازے پر آیا، خادم نے پوچھا: تمہاری حاجت کیا ہے؟

جواب دیا: میری حاجت شریف کی خدمت میں سلام کرنا ہے۔

خادم نے کہا: اپنے مصلے پر عبادت میں مشغول ہیں۔

عنوان چوکھٹ پر بیٹھ گیا، خادم نے باہر آکر کہا: برکت خدا کی خدمت میں حاضر ہو۔

عنوان کہتا ہے: داخل ہو کر میں نے سلام کیا۔ آپ - نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: بیٹھ جاؤ، خدا تمہاری بخشش فرمائے۔ کچھ دیر تک آپ سر جھکائے بیٹھے رہے، اس کے بعد سر اٹھا کر میری کنیت کے بارے میں پوچھا اور دعا دی۔

میں نے خود سے کہا: اس سلام وزیارت سے اگر اس دعا کے علاوہ کوئی دوسری چیز میرے نصیب میں نہ ہو تو یہی دعا بہت ہے۔

اس کے بعد سر اٹھا کر فرمایا: کیا چاہتے ہو؟

میں نے کہا: خدا سے التجا کی ہے کہ آپ کے دل کو میری طرف متوجہ اور آپ کے علم سے مجھے بھی کچھ نصیب کرے، امیدوار ہوں میری دعا قبول ہو چکی ہو۔

آپ - نے فرمایا: اے اباعبداللہ! علم تعلم سے نہیں، علم ایسا نور ہے کہ خدا جس کی ہدایت چاہتا ہے اس کے دل میں قرار دے دیتا ہے، پس اگر تمہاری مراد علم ہے تو اپنے اندر حقیقت بندگی کو طلب کرو اور علم کو اس کے استعمال وعمل کے ذریعے طلب کرو اور خدا سے فہم مانگو تا کہ تمہیں سمجھائے۔

میں نے کہا: حقیقت بندگی کیا ہے؟

آپ نے فرمایا: تین چیزیں ہیں:

یہ کہ خدا کا بندہ، جو کچھ اسے خدا نے عطا کیا ہے، خود کو اس کا مالک نہ سمجھے، کیونکہ بندگان خدا کسی چیز کے مالک نہیں ہوتے، مال کو خدا کا مال سمجھتے ہیں اور جس جگہ خدا حکم دے وہاں خرچ کرتے ہیں۔

اور یہ کہ بندہ اپنے لئے کوئی تدبیر نہ کرے۔

اور یہ کہ وہ صرف اس بات میں مصروف ہو کہ خدا نے اسے کس چیز کا حکم دیا ہے اور کن امور سے روکا ہے۔

پس جب خود کو کسی مال کا مالک نہ سمجھے گا تو خدا نے جہاں جہاں مال کے انفاق کا حکم دیا ہے اس کے لئے انفاق آسان ہو جائے گا، جب اپنی تدبیر اپنے مدبّر کو سونپ دے گا تو مصائب دنیا اس پر آسان ہو جائیں گے اور خدا کے امر ونہی میں مصروف عمل ہونے سے اسے لوگوں کے ساتھ فخر ومباہات اور ریاکارانہ بحث کی فرصت نہ ملے گی۔ پس جب خدا نے اپنے بندے کا ان تین صفات کی وجہ سے اکرام واحترام کر دیا تو دنیا شیطان اور خلق اس کے لئے سہل و آسان ہو جائیں گے، مال ودولت کو جمع آوری اور فخر فروشی کے لئے طلب نہیں کرے گا اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اسے اپنی عزت وبرتری کے لئے نہیں چاہے گا اور اپنی زندگی کے ایام لغو وبے کار باتوں میں نہیں گنوائے گا۔

یہ تقویٰ کا پہلا درجہ ہے، کہ خداوندتبارک و تعالیٰ نے فرمایا:﴿تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا﴾(۶۱)

میں نے کہا: اے ابا عبداللہ! مجھے وصیت فرمائیں۔

امام -نے فرمایا: تمہیں نو چیزوں کے بارے میں وصیت کرتا ہوں اور جن کا مقصود و مطلوب راہ خدا ہے، ان کے لئے بھی میری یہی وصیت ہے، خدا تمہیں ان پر عمل پیرا ہونے میں کامیاب فرمائے۔

تین وصیتیں ریاضت نفس، تین وصیتیں حلم اور تین وصیتیں علم کے بارے میں ہیں۔ ریاضت کے بارے میں میری وصیت یہ ہے کہ: اس چیز کے کھانے سے پرہیز کرو جسے کھانے کی طلب نہ ہو کہ یہ کم عقلی و نادانی کا سبب ہے۔ جب تک بھوک نہ ہو نہ کھاؤ۔ جب بھی کھاؤ، حلال کھاؤ، خدا کے نام سے شروع کرو اور پیغمبر اکرم ﷺ کی حدیث یاد رکھو کہ آپ ﷺ نے فرمایا: انسان نے اپنے شکم سے بدتر ظرف کو پُر نہیں کیا، پس اگر ناچار ہو تو اس کی ایک تہائی کو کھانے، ایک تہائی کو پینے اور ایک تہائی کو سانس لینے کے لئے خالی رکھے۔

حلم کے بارے میں میری وصیت یہ ہے کہ: جو کوئی تم سے کہے: اگر ایک کہی تو دس سنو گے، اس کے جواب میں کہو: اگر دس بھی کہو تو ایک نہ سنو گے۔ جو تمہیں ناروا باتیں کہے اس کے جواب میں کہو: جو کچھ تم نے کہا اگر اس میں سچے ہو میری خدا سے التجا ہے کہ مجھے بخش دے اور اگر جھوٹے ہو تو خدا سے تمہاری بخشش چاہتا ہوں اور جو تمہیں ناز یبا و رکیک کہنے کا وعدہ دے تم اسے نصیحت کا وعدہ دو۔

اور علم کے بارے میں میری وصیت یہ ہے کہ: جو کچھ نہیں جانتے صاحبان عقل سے پوچھو، لیکن ان کو آزمانے یا شرمسار کرنے کی غرض سے کبھی ان سے نہ پوچھنا، جس چیز کو نہیں جانتے اس کے بارے میں اپنی ذاتی رائے اور گمان پر ہرگز عمل نہ کرنا، جہاں تک ممکن ہو احتیاط پر عمل کرو، فتویٰ دینے سے اس طرح پرہیز کرو جیسے شیر سے دور بھاگتے ہو اور اپنی گردن کو لوگوں کے گزرنے کے لئے پل قرار نہ دو۔

اٹھ کھڑے ہو کہ تمہیں وصیت کر چکا اور میرے ورد کو میرے لئے فاسد قرار نہ دو کہ میں اپنے آپ میں مشغول ہوں ﴿وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ﴾(۶۲)

اس مختصر مقدمے میں ان آیات و روایات کی تشریح بیان کرنا ناممکن ہے۔ ان آیات میں سے ہر آیت اور روایات کے ہر جملے کو سمجھنے کے لئے مفصل بحث کی ضرورت ہے، لہذا جو کچھ بیان کیا گیا اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

آخر میں دو نکات کی جانب توجہ ضروری ہے۔

۱۔ دین کے سامنے سر تسلیم خم کرنا

دین اسلام کے اصول و فروع کا ملاحظہ، عبادات و معاملات میں تفکر، نفس انسانی، گھر اور شہر کی تدبیر کے بارے میں اس دین کے طور طریقوں میں تامل اور مستحبات و مکروہات کے سلسلے میں اس دین کے بتائے ہوئے آداب میں تدبر، ان قوانین میں حکمت بالغہ کے بیان گر ہیں۔ یہ طبیعی امر ہے کہ تمام احکام کی حکمت کو درک کرنا بلکہ انسان کی سعادت پر مبنی دین میں، کسی بھی ایک حکم کی تمام حکمت کا درک سوائے اس فرد کے لئے میسر نہیں جو ان عوالم اور ان میں موجود انسان کی ضروریات اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے طریقوں پر محیط ہو۔ کسی حکم کی حکمت کو نہ جاننا اس حکم میں عدم حکمت کی دلیل نہیں ہوسکتا۔

اور جس طرح کتاب خلقت میں محکمات و متشابہات موجود ہیں اسی طرح کتاب تشریع میں بھی محکمات و متشابہات پائے جاتے ہیں اور متشابہات کی بنا پر محکمات سے ہاتھ نہیں اٹھایا جاسکتا، اسی طرح متشابہات کو نظام خلقت و دین میں عبث ولغو قرار نہیں دیا جاسکتا ﴿وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾(۹۳)

اور یہ جاننا ضروری ہے کہ انسان کی دنیوی زندگی، آخرت کی بہ نسبت رحم مادر میں جنین کی زندگی کے مانند ہے، کہ رحم مادر میں اسے جو اعضاء اور طاقتیں عطا کی جاتی ہیں، اگر جنین عقل و شعور رکھتا بھی ہوتو ان اعضاء کے استعمال اور ان کے فوائد کو درک کرنا اور انہیں عملی جامہ پہنانا اس کے لئے ناممکن ہے، وہ دماغ کی پیچیدہ اور پر اسرار بناوٹ کی حکمت کو نہیں جان سکتا یا اسی طرح وہ نہیں سمجھ سکتا کہ دیکھنے اور سننے کی مشینری اور نظام تنفس اس کے کس کام کے ہیں۔ دنیا میں آنے کے بعد اس کے لئے ان سب کی حکمت واضح ہوگی۔

اسی طرح طبیعت کے رحم مادری میں زندگی گزارنے والے انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ وحی الٰہی کی تعلیم و تربیت کے وسیلے سے ان اعضاء و صلاحیتوں سے لیس ہو جو اس کی حیات ابدی کے ساز و سامان ہیں اور اس کے لئے ان احکامات کی حکمت عالم آخرت میں قدم رکھنے کے بعد واضح و روشن ہوگی، جہاں کی اس دنیا سے وہی نسبت ہے جو دنیا کی رحم مادر سے ہے۔

لہذا، دین کے سامنے سر تسلیم خم کرنا، انسانی خلقت کی ضروریات میں سے، بلکہ کمال انسانی کی ضروریات میں سے ہے، کیونکہ عامل کی اہمیت عمل سے اور عمل کی اہمیت اس عمل کے داعی اور محرک عامل سے ہے۔ معصوم علیہ السلام

کا بیان بھی اسی حقیقت کی جانب ہماری راہنمائی کرتا ہے((إنما الأعمال بالنیات و لکل امرءٍ ما نوی))(۶۴) لہٰذا کسی قسم کی مصلحت و مفسدہ اور نفع و ضرر سے چشم پوشی کرتے ہوئے، صرف خدا کے لئے اطاعت خدا بجالانا، مقام مقربین کی علامت ہے۔

۲۔علماء دین کی تقلید کا لازم وضروری ہونا

ایسے افراد کے لئے علماء دین کی تقلید کرنا ضروری ہے، جو احکام خدا کے استنباط کی قدرت نہیں رکھتے۔ انسان، جس کی زندگی وسلامتی، قوانین وقواعد کے تابع ہے، اس کی حفاظت وسلامتی کے لئے ضروری ہے کہ یا خود طبیب ہو یا کسی قابلِ اعتماد و ماہر طبیب کی طرف رجوع کرے اور اس کے احکامات کے مطابق عمل کرے یا احتیاط کا دامن تھام لے اور جس چیز کے بارے میں اسے یہ احتمال ہو کہ اس سے اسے نقصان پہنچ سکتا ہے اس سے پرہیز کرے، یہاں تک کہ اس کے بارے میں جان لے یا کسی صاحب علم سے پوچھ لے۔

بلکہ چاہے عالم ہو یا جاہل، تقلید انسان کی ضروریاتِ زندگی میں سے ہے۔ جاہل کے لئے تقلید کی ضرورت کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ عالم کے لئے بھی اس اعتبار سے تقلید کی ضرورت ہے کہ ہر دانشمند کے علم کا دائرہ محدود ہے۔ مثال کے طور پر گھر بنوانے کے سلسلے میں ڈاکٹر کے لئے انجینئر اور معمار کی تقلید کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے بعد اس کے لئے ہواباز اور بحری جہاز میں قدم رکھنے کے بعد بغیر کسی چوں وچرا کے ناخدا کی تقلید ضروری ہے۔

بلکہ علم طب میں مختلف شعبوں کے وجود میں آنے کی وجہ سے اگر کوئی ایک عضو میں مہارت حاصل کر چکا ہو تب بھی باقی اعضاء میں اس کے لئے دوسرے ڈاکٹروں کی تقلید ضروری ہے۔ نتیجے کے طور پر کسی بھی فرد کے لئے تقلید کے بغیر زندگی گزارنا ناممکن ہے۔

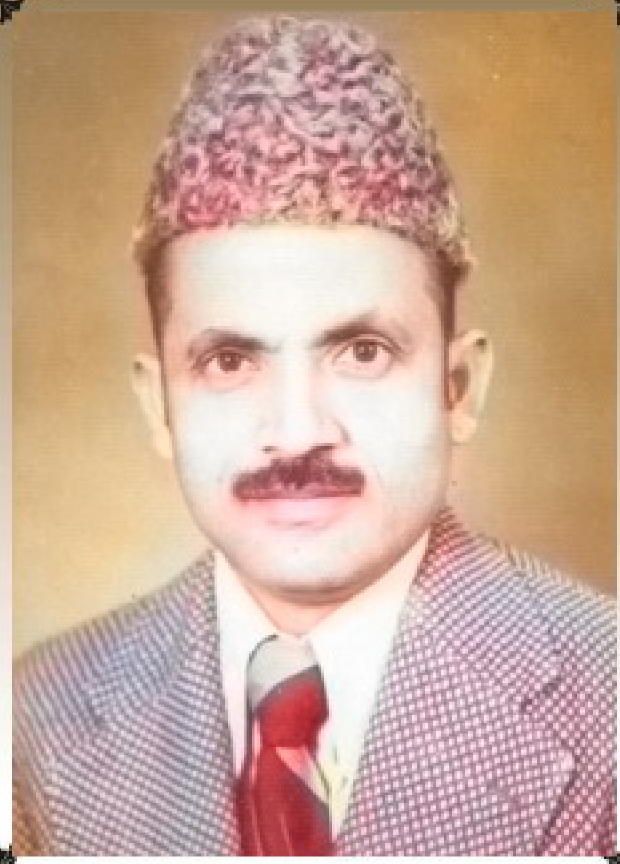
اسی لئے دین پر ایمان رکھنے والا جانتا ہے کہ اس کے لئے دین میں جو احکام معین کئے گئے ہیں، بحکم عقل و فطرت انسان مجبور ہے کہ وہ ان احکام کو جاننے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے ان تین میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب کرے۔ یا ان کے بارے میں تحصیل علم کرے یا ان کا علم رکھنے والے ماہر و متخصص کی پیروی کرے اور یا

احتیاط کا راستہ اختیار کرے۔ لیکن ایسی صورت میں کہ جب نہ تو ان احکام کا علم رکھتا ہو اور نہ ہی احتیاط پر عمل پیرا ہو اس کے لئے فقط ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی عالم کے نظریات کے مطابق ان احکام پر عمل کرے اور اگر ان احکام میں محققین و ماہرین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہو تو ان میں سے اعلم کی تقلید کرے۔ جیسا کہ کسی بیماری کی تشخیص و علاج میں اگر چند ڈاکٹروں کے درمیان اختلاف نظر ہو ان میں سے اعلم کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

اور چونکہ دین اسلام دین علم ہے اور ہر عمل کی بنیاد، چاہے بالواسطہ ہی سہی، ضروری ہے کہ علم کی بنیاد پر ہو، تقلید کی بنیاد بھی علم، عقل اور فطرت پر ہے جو درحقیقت احکام دین میں عالم و مجتہد کی مستند رائے و نظر پر اعتماد کرنے کا نام ہے ﴿وَلاَ تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولاً﴾(۶۵)

❁❁❁❁❁

معروف کتب پر مبنی کمپیوٹرڈ ڈی وی ڈی



بیادِ سید وصی حیدر رضا زیدی



کتابوں کی لسٹ ڈی وی ڈی کور کی پشت پر ملاحظہ فرمائیں۔

خصوصی تعاون: حجتہ الاسلام سید نو بہار رضا نقوی (فاضل مشہد، ایران)

سگِ درِ بتولؑ: سید علی قنبر زیدی ۔ سید علی حیدر زیدی

التماس سورہ فاتحہ برائے ایصالِ ثواب سید وصی حیدر رضا زیدی ابنِ سید حسین احمد زیدی (مرحوم)